تعلیم و تربیت
اگست 2014
یوم آزادی
مبارک

حمد باری تعالیٰ
ایک اللہ واحد اللہ بے مثل اور لاجواب
اس کا نہیں ثانی کوئی اس کے ہی جلوے بے حساب
آسمانوں کی ہر اک شے اور زمیں جو کچھ بھی ہے
اس کی تسبیح میں لگے ہیں ہے جو مقصودِ کائنات
مرتبہ پائے اسی سے انبیاء اور اولیاء
ورنہ مردی اور قلندری کا ہے غروب آفتاب
دہر کے ظلمت کدے کو اس نے یہ بخشا ہے نور
شمس و قمر ہوں یا ستاروں کی تجلی بے حساب
اوّل بھی وہ آخر بھی وہ ظاہر بھی وہ باطن بھی وہ
قرب اپنا بندوں کو بخشے جو کریں حق کا انتخاب
انبیاء کو ناز اس پہ ناز وہ ان پہ کرے
انبیاء فخرِ زماں ہیں اور خدا عالی جناب
ہے دعا میری کہ اس کی راہ سے نہ دور ہوں
وہ راہ کہ تکمیل تجلی محمد مصطفیٰ عزت مآب
نعت رسول مقبول
ہر سو نظر آتے ہیں اس شمع کے پروانے
سورج کی طرح روشن ہیں احمد کے دیوانے
محبت میں بڑھے آگے بلالؓ اور اویس قرنیؓ
ممکن نہیں کہ ہوں ایسے کسی اور کے دیوانے
بھاتی نہیں آنکھوں کو شاہوں کی کبھی شاہی
دربار رسالت سے وابستہ جو آستانے
صفہ کے مکینوں پر جو علم کی بارش تھی
اس تک نہ ابھی پہنچے دنیا کے کتب خانے
ہم آج اس دنیا میں کمتر نہ نظر آتے
اے کاش نہ ہوتے جو اس اسوہ سے بیگانے
ہیبت تھی جلالت تھی سطوت تھی مروت تھی
سب ان کی عنایت سے دنیا میں تھے پہچانے
احمد کی غلامی ہی سرمایہ ہمارا ہے
یہ دولت بہتر ہے اے کاش ہر اک مانے

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں خوب صورتی کے رنگ بھرے ہیں اور ہمارے لیے ان گنت نعمتیں پیدا کی ہیں جن کو اگر ہم گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ آسمان کی چھت، زمین کا تخت، کرنیں بکھیرتا آفتاب، چاندنی بکھیرتا ماہتاب، بارش کی بوندیں، سرسبز اور لہلہاتی کھیتیاں، سایہ دار شجر (درخت)، رنگ دار حجر (پتھر) اور ذائقہ دار ثمر...... یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ "اور تم نے جو کچھ مانگا اس نے اس میں سے (جو تمہارے لیے مناسب سمجھا) تمہیں دیا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار (بھی) نہیں کر سکتے"۔ (سورۂ ابراہیم، آیت:34)

آیئے! اس کو عام مثال سے سمجھتے ہیں:

(1) ہمارے جسم میں ہر ایک بال اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اگر آپ اپنے سر اور بدن کے تمام بال شمار کرنا چاہیں تو ان کو شمار نہیں کر سکتے۔

(2) ہمارے جسم میں مسامات ہیں جن سے پسینہ نکلتا ہے، اگر آپ ان کو شمار کرنا چاہیں تو شمار نہیں کر سکتے۔

(3) زندگی کے جملہ اوقات میں ہمارا ہر بر آنے والا سانس ہماری زندگی کی ضمانت بنتا ہے اور یہ ایک مستقل نعمت شمار ہوتا ہے، اگر ان سانسوں کو آپ شمار میں لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔

اب بتایئے! جب آپ اپنے جسم کے تمام بال، تمام مسام اور اپنے جملہ سانس نہیں گن سکتے تو مجموعہ انعامات اور احسانات کا شمار میں لانا بھلا کہاں ممکن ہوگا؟

سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اور پھر بار بار فرمایا ہے کہ "تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"؟ یہ جملہ بار بار ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ ہمیں توجہ دلا رہے ہیں کہ اے آدم کی اولاد! تم ان نعمتوں کی قدر کرو، ان نعمتوں کا شکر ادا کرو اور ان نعمتوں کی ناشکری مت کرو۔

اللہ رحیم و کریم کا ارشاد ہے کہ "اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو میرا عذاب بڑا سخت ہے"۔ (سورۂ ابراہیم، آیت:7)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

(1) شکر کرنے سے نعمتوں کی قدر دانی ہوتی ہے۔

(2) شکر کرنے سے نعمتیں باقی رہتی ہیں۔

(3) شکر کرنے سے نعمتوں میں اضافہ اور ترقی ہوتی ہے۔

جب کہ ناشکری کرنے سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں اور طرح طرح کے مصائب و مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے۔

اس لیے پیارے بچو! ہم اپنے رب کا شکر ادا کرتے رہیں اور کبھی بھی ناشکری مت کریں۔

جوں ہی شام کا دھندلکا پھیلنے لگتا، بچے تھڑے سے اُٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے۔ ''اماں پاکستان'' بھی اپنا گھیردار برقعہ اُٹھائے اپنے گھر کو چل دیتیں۔ آہستہ آہستہ اندھیرا گہرا ہونے لگتا۔ محلے کے سبھی گھر رات کی نیند کے مزے لینے کے لیے سونے کی تیاری کرنے لگتے۔ گلی میں ہو کا عالم ہوتا۔ فقط چاند کی روشنی اور کھمبے پر لگا بلب گلی کو روشن کرتا۔ گلی میں بکھرا کوڑا کرکٹ نمایاں طور پر نظر آتا۔

ایسے میں ایک گھر کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک سایہ گھیر دار کپڑے میں ملبوس نکلتا ہے۔ ہاتھ میں ایک ڈبہ نظر آتا ہے۔ سایہ کھمبے پر لگا بلب بجھا دیتا ہے۔ اب گلی میں مکمل اندھیرا ہے۔ سائے نے جلدی جلدی سارا کوڑا صاف کیا اور ڈبے میں ڈال کر گلی کی نکڑ پر رکھ دیا اور کھمبے کا بلب روشن کیا۔ اب گلی صاف ستھری نظر آنے لگی۔ سائے نے اپنے ہاتھ فضا میں دعا کے لیے اُٹھائے جس میں ''میرا گھر'' کی تکرار سنائی دی اور سایہ جلدی سے اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا۔

☆☆

کلثوم جب اپنے دروازے پر آئی تو دہلیز پر کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کلثوم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے نہایت غصے سے سامنے والے گھر کی طرف دیکھا، جہاں عذرا اپنے گھر کے سامنے جھاڑو لگا رہی تھی۔

''تم نے میرے گھر کے سامنے کوڑا کیوں پھینکا؟'' کلثوم نے عذرا کو چیخ کر مخاطب کیا۔

''یہ گلی تیری خریدی ہوئی نہیں، میں جہاں چاہوں کوڑا پھینکوں، تو کون ہوتی ہے کہنے والی۔'' عذرا نے بھی حسب توقع وہی جواب دیا جو وہ روزانہ کلثوم کو دیا کرتی تھی۔

''یہ میرا گھر ہے، خبردار آئندہ ایسی جرأت کی۔'' کلثوم نے سینے پہ ہاتھ مار کر کہا اور اندر پلٹ گئی۔

عذرا نے اونہہ کر کے سر کو جھٹکا دیا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''تیری کون پرواہ کرتا ہے۔''

یہ جھگڑا ان کا روز کا معمول تھا۔ گلی اسی طرح کوڑے سے بھر جاتی اور رات کو صاف ہو جاتی۔ صبح اُٹھ کر جو بھی گلی کو دیکھتا، صاف ستھری ہوتی اور طبیعت پر ایک خوش گوار تاثر لیتا۔

☆☆

کلثوم اپنے گھر کے متعلق بہت جذباتی اور حساس تھی۔ فاطمہ بتول، کلثوم کی بھانجی تھی جو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اس کے

پاس آئی تھی۔ وہ اتنے دنوں سے اپنی خالہ کے منہ سے لڑائی کے وقت میرا گھر کی تکرار سنتی رہی تھی۔

"خالہ! آپ اپنے گھر کے متعلق اتنی حساس کیوں ہیں؟ سب کو اپنے گھر عزیز ہوتے ہیں لیکن آپ بے حد حساس ہیں۔" فاطمہ بتول نے اپنی خالہ سے پوچھا۔

"بیٹا! شاید تمہیں معلوم نہیں یہ گھر میں نے بہت سی مصیبتوں اور تکلیفیں سہنے کے بعد حاصل کیا ہے، جسمانی اور ذہنی اذیت برداشت کی ہے۔" کلثوم دل گرفتہ تھی۔

"خالہ! کیا ہوا تھا، کچھ بتایئے بھی۔" فاطمہ نے ٹٹولا۔

"جب میری شادی ہوئی تم اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ میں بیاہ کر بھرے سسرال میں آئی، مشترکہ خاندان تھا۔ میرے ساس سسر کے تمام بچے شادی شدہ تھے اور ایک بڑے گھر میں رہتے تھے۔ تم تو جانتی ہو سسرالی رشتے دار ایک ہی گھر میں رہتے ہوں تو لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی ہے لیکن میرے شوہر کے بڑے بھائی اور بیوی مجھے برداشت نہیں کرتے تھے۔ میں سکون اور آزادی سے اپنے کام نہیں کرسکتی تھی۔ میں بہت برداشت کرتی لیکن کبھی کبھار غصے میں انہیں جواب بھی دے دیتی۔ قدرت کی حکمت ہم جیسے انسانوں کی عقل سے بالاتر ہے۔

میرے دو بچے تھے کہ تمہارے خالو کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ میرے سر پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بیوگی اور بچوں کا ساتھ، یہ سب کچھ مجھے ہولا رہا تھا۔ میرے سسرالیوں کی زیادتیاں بڑھتی گئیں۔ میں نے تنگ آ کر سوچا کہ ایک ہی گھر میں اتنے اختلافات کے ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ میں نے علیحدہ گھر کا مطالبہ کردیا جس سے میرے سسر نے مزید ظلم ڈھانے شروع کر دیے۔ میں کتنا برداشت کرتی۔ یہ سوچ مجھے تکلیف دیتی کہ اگر میرے ساتھ ایسا سلوک ہوتا رہا تو میرے بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور تعلیمی تربیت پر بہت برا اثر پڑے گا۔ لہٰذا میں نے ایک وکیل سے رابطہ کر کے عدالت کے ذریعے علیحدہ گھر کا دعویٰ کر دیا۔ مجھے بہت دھمکیاں بھی ملیں لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور تم دیکھو آج یہ گھر میرا اپنا ہے جہاں میں آزادی سے رہتی ہوں۔ میرے بچے لائق ہیں اور مجھے ہر طرح کا سکون ہے۔" خالہ کلثوم نے اپنی بپتا سنائی۔

فاطمہ کو ایک بات بہت ناگوار گزری کہ خالہ کو اپنا گھر اتنی جدوجہد سے ملا اور یہ مملکت جس میں آزادی ہے اور سکون ہے اس کو کتنا گندہ کرتی ہیں۔ خیر خالہ کے دل میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کرنا تھا لیکن وہ گھڑی نہیں آئی تھی ابھی۔

☆☆

"آپا فاطمہ! جلدی آیئے، اماں پاکستان کہانی سنانے لگی ہیں۔" ایک بچے نے فاطمہ کو بلایا۔

اماں پاکستان اپنے تھڑے پر بچوں کو اپنے اردگرد لپٹائے بیٹھی تھیں۔

"اماں! آپ کا نام پاکستان کس نے رکھا؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"بیٹی! یہ ایک دکھ بھری طویل داستان ہے۔" اماں نے سرد آہ بھری۔

"متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ہی جگہ اکٹھے رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ نظریہ پاکستان تخلیق ہو چکا تھا۔ دنیا کے نقشے پر پاکستان ظاہر ہو رہا تھا۔ تنگ نظر ہندوؤں نے بھارت کی تقسیم کو قبول نہ کیا۔ بھارت کی تقسیم کا مسلمانوں کو مزا چکھانے کے لیے ہندو اور سکھ مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے لگے۔ میں اس وقت گیارہ برس کی تھی۔ ہر طرف فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ چیخ پکار، قتل و غارت اور مار دھاڑ شروع ہو چکی تھی۔ ہندو اور سکھ تلواریں، لاٹھیاں اور سونٹے اٹھائے مسلمانوں کو للکارتے اور حملہ کرتے۔ ماں کو بچے کی، بھائی کو بہن کی، شوہر کو بیوی کی خبر نہ تھی۔ میں نے بہت عبرت انگیز اور دل گیر مناظر دیکھے ہیں۔ ہندو اور سکھ بدمست اور پاگل ہو چکے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا۔ سکھوں نے شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں کی چھاتیوں پہ کاٹ ڈالا۔ وہ شیر خوار بچوں کو اوپر ہوا میں اچھالتے اور نیچے نیزے پر لے لیتے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی۔ مسلمانوں عورتوں نے عصمت دری کے خوف سے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی۔ آدمیوں سے بھری موٹروں کو آگ لگا دی جاتی۔ مسلمان بچوں کو زندہ جلایا گیا۔ ٹرینیں لاشوں سے بھری خون آلود ہو جاتی تھیں۔ روزانہ مسلمانوں کو کاٹ کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا۔"

اماں کی آواز رندھ گئی۔ آنسوؤں کا پھندہ گلے میں اٹک گیا۔ بچے دم بخود یہ سب سن رہے تھے۔

''یہ وطن تمہیں بنا بنایا مل گیا ہے بچو! سنا تم نے پاکستان کیسے بنا۔ اس وقت زمین شہیدوں کے لہو سے لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ کتے، گدھ اور کوے لاشوں کو نوچتے اور گھسیٹتے۔ ان دنوں سیلاب بھی آیا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں موسلا دھار بارشیں ہو رہی تھیں۔ بجلی کی کڑک دل ہلا دیتی تھی۔ بجلی کی کڑک جب لاشوں پر پڑتی تو ایک ہول ناک منظر پیش کرتی۔ لوگوں نے اپنے پیاروں کو پانی میں ڈوبتے اور مرتے دیکھا۔ کئی لوگ یہ سب دیکھ کر اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھے تھے لیکن بچو! اس پُرآشوب وقت میں بھی مسلمانوں نے اخوت اور ایثار کی مثالیں پیش کی تھیں۔''

''اماں! تو پھر آپ کا نام پاکستان کیسے پڑا؟''

''میں اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرا خاندان بیس پچیس افراد پر مشتمل تھا جو میری آنکھوں کے سامنے ذبح ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں سے بچتے بچاتے پاکستان کے مہاجر کیمپ میں پہنچ گئی۔ وہاں میں نے مہاجرین کی خدمت کی۔ اپنے حصے کا خلوص اور ایثار ان پر لٹایا۔ اپنی محبتیں پاکستان کے لیے وقف کر دیں۔ مصیبتیں تو بہت جھیلیں لیکن آزادی کی نعمت سے بھی مالا مال ہو گئی۔

جو بھی میرا نام پوچھتا میں اسے اپنا نام پاکستان بتاتی۔ یہ سن کر سب خوشی سے جھوم اٹھتے اور یوں سبھی مجھے آپی پاکستان اور پھر اماں پاکستان کہنے لگے۔''

''اماں! آپ نے تو ہمارے دل پگھلا دیے، ہم ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے آزادی کی خاطر جانیں قربان کیں۔'' فاطمہ بولی۔

''ہاں بیٹا! پاکستان میرا عشق ہے۔''

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
اس عشق میں، میں نے کیا کیا نہ دیکھا

اماں نے شعر کے ذریعے اپنی مصیبتوں کی عکاسی کی۔

''بچو! اندھیرا ہو رہا ہے۔ اپنے اپنے گھروں کو چلو اور سو جاؤ۔'' یوں یہ نشست برخاست ہوئی۔

☆☆

''فاطمہ آپی! رات کو روزانہ کوئی گلی کا سارا کوڑا صاف کر دیتا ہے۔ نہ جانے کون ہے؟'' ایک بچے نے کہا۔

''اب ہمیں اس بندے کو پکڑنا ہے، آج رات ہی یہ کام کریں گے۔'' فاطمہ نے منصوبہ بندی کی۔

حسب معمول رات کے وقت وہی سایہ گھر سے نمودار ہوا۔ کھمبے کا بلب بند کیا اور سارا کوڑا ڈبے میں ڈالا اور نکڑ پر رکھ دیا۔ اب بلب روشن کر کے سایہ اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک سب بچوں نے اس سائے کو دبوچ لیا۔ سایہ تھوڑا سا کسمسایا۔ جھٹ سے فاطمہ نے اس برقعہ پوش کا نقاب الٹ دیا۔ سب حیرت سے اماں پاکستان کو دیکھ رہے تھے۔ اماں نے ایک سرد آہ بھری اور آگے بڑھ گئیں۔

''ٹھہر جائیے اماں پاکستان!'' فاطمہ نے انھیں روکا۔

چند لمحوں کے بعد فاطمہ، عذرا اور کلثوم کا ہاتھ پکڑے ان کی طرف آ رہی تھی۔ خالہ کلثوم! یہ ہیں ہماری اماں جو سارے پاکستان کو اپنا گھر کہتی ہیں۔ ساری گلی کو اپنا گھر سمجھ کر صاف کرتی ہیں۔ ایک آپ ہیں جنھیں صرف اپنا ذاتی گھر عزیز ہے جس کے سامنے آپ گندگی برداشت نہیں کرتیں۔''

''لیکن ہم سب کا گھر تو پیارا پاکستان ہے۔ ہم بھی اسے اپنے گھر کی طرح صاف رکھیں گے۔'' فاطمہ نے ان کو احساس دلایا۔ کلثوم اور عذرا اب بہت نادم تھیں۔ اماں پاکستان نے آگے بڑھ کر ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دیے اور علامہ اقبال کا شعر ترنم سے پڑھنے لگیں۔

بے باک صداقت ہو، بے لوث محبت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورت مینا دے

☆☆

اگلا دن ایک روشن اور نئی صبح تھی۔ سب بچوں نے مل کر کوڑے دان بنا کر گھروں کے سامنے رکھ دیے۔ کلثوم اپنے گھر سے نکلی اور عذرا کے گھر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے جھاڑو لگا رہی تھی۔ اس نے عذرا کے دروازے کی طرف دیکھا۔

''اُف عذرا بہن! کتنی گرد جم گئی ہے تمہارے گھر کے سامنے، اور پھر جھاڑو سے اس کے گھر کی دہلیز کو جھاڑو سے صاف کر دیا۔

اماں پاکستان، فاطمہ اور بچے ایک طرف کھڑے خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ اماں پاکستان اور بچوں نے ایک بھرپور نعرہ لگایا۔

چاند میری زمیں پھول میرا وطن

☆☆☆

زمانہ گزرا، کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ بڑا عقل مند اور سمجھ دار۔ وہ ابھی تک کنوارا تھا، کیوں کہ اسے اپنی پسند کی ملکہ نہیں ملتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ملکہ اتنی خوب صورت ہو کہ چاند بھی دیکھے تو شرمائے، اور سمجھ دار اتنی ہو کہ سقراط اور بقراط بھی اس کے آگے پانی بھریں۔

وزیروں نے چار کھونٹ گھڑ سوار دوڑائے کہ ان صفتوں والی لڑکی جہاں بھی ملے فوراً آ کر خبر کریں مگر سال ہا سال کی تلاش کے باوجود کوئی ایسی لڑکی نہ مل سکی۔ جو لڑکیاں عقل مند اور تیز طرار تھیں، وہ خوب صورت نہ تھیں اور جو صورت میں چندے آفتاب چندے ماہ تاب تھیں، ان کی کھوپڑی میں عقل کی جگہ بھس بھرا ہوا تھا۔ بادشاہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ اسے دن رات یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کے بعد اس کی سلطنت کا وارث کون ہو گا۔ آخر ایک دانا وزیر نے اسے مشورہ دیا کہ حضور غریب آدمی کا بھیس بدل کر نگر نگر پھریں۔ ممکن ہے کسی گدڑی میں کوئی لعل چھپا ہوا مل جائے۔

بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے ایک غریب بوڑھے کا بھیس بدلا اور شاہی محل سے نکل کھڑا ہوا۔ ابھی شہر سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک کسان ملا جو کاندھے پر لاٹھی رکھے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے سلام کیا اور بولا۔ ''بھائی، اگر تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو تو میں تمہیں بھی سواری میں بٹھا لوں گا۔''

کسان نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور تعجب سے بولا۔ ''بڑے میاں، تم تو خود پیدل چل رہے ہو، مجھے سواری میں کیا بٹھاؤ گے۔''

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا اور دونوں چپ چاپ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ کلمۂ شہادت کی آواز آئی۔ چند لوگ چارپائی پر ایک مردے کو ڈالے قبرستان سے لے جا رہے تھے۔ بادشاہ نے جنازے کی طرف دیکھا اور کسان سے پوچھا۔ ''یہ آدمی زندہ ہے یا مردہ؟''

کسان نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ "تمھیں دکھائی نہیں دیتا؟ بھلے آدمی، اگر یہ زندہ ہوتا تو لوگ اسے قبرستان کیوں لے جاتے؟ تمھارے دماغ کا ضرور کوئی نہ کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔"

اب وہ ایک کھیت کے پاس سے گزرے، جس میں گیہوں کے پودے کھڑے جھوم رہے تھے۔ کسان نے کہا۔ "کتنی اچھی فصل ہے!"

بادشاہ بولا "بہت اچھی لیکن پتا نہیں کٹی ہوئی ہے یا ان کٹی۔"

کسان چلتے چلتے رک گیا اور چلا کر بولا۔ "تمھیں نظر نہیں آتا کہ یہ فصل کٹی ہوئی ہے یا ان کٹی؟"

بادشاہ نے آہستہ سے کہا۔ "میرے بھائی! بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہوتی کچھ ہیں اور دکھائی کچھ دیتی ہیں۔"

بے چارے کسان کی سمجھ میں یہ فلسفہ نہ آیا۔ ناچار چپ ہو رہا۔ یوں ہی چلتے چلتے شام ہو گئی اور کسان کا گاؤں آ گیا۔ اس نے بادشاہ سے پوچھا۔ "بڑے میاں تم کہاں جاؤ گے؟"

بادشاہ نے کہا۔ "بابا ہم فقیروں کا کیا ہے جہاں سر چھپانے کو جگہ ملی، پڑ رہے۔ ویسے میری منزل ابھی سولہ کوس دور ہے۔ سوچتا ہوں، صبح ہی کو جاؤں۔ تھک بھی گیا ہوں اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔ تمھارے گاؤں میں سرائے تو ہو گی؟"

دیہاتی بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ کسان نے سوچا یہ بے چارہ رات میں کہاں دھکے کھاتا پھرے گا۔ پتا نہیں اس کے پاس پیسے بھی ہیں یا نہیں۔ کیوں نہ اسے اپنے گھر لے چلوں۔ رات ہی کی تو بات ہے۔ صبح کو تو چلا ہی جائے گا۔

اس نے کہا۔ "بڑے میاں، یہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں سرائے کہاں۔ تم میرے گھر چلو وہیں کسی کونے میں پڑے رہنا۔"

"خدا تمھیں خوش رکھے۔" بادشاہ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "تمھارے گھر میں کتنے آدمی ہیں؟"

"تین......" کسان نے کہا۔ "ایک میں، ایک میری بیوی اور ایک میری لڑکی۔"

"لڑکی کی شادی ہو گئی ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، کسان نے جواب دیا "لیکن یہ خیال ہے کہ یہ فصل بیچ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

یہ کہہ کر اس نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیوی بڑی بے چینی سے اس کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک اجنبی کو اس کے ساتھ دیکھا تو جلدی سے چارپائی پر چینی چادر بچھا دی۔ گھر تھا تو چھوٹا سا مگر خوب صورت اور صاف ستھرا معلوم ہوتا تھا کہ کسان نے عمر بھر کی کمائی مکان ہی پر لگا دی ہے۔ ایک طاق میں کڑوے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ اچانک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک لڑکی نکلی۔ ایک دم ایسا معلوم ہوا جیسے چودھویں کا چاند آسمان سے زمین پر اتر آیا ہو۔ لڑکی نے بڑے ادب سے بادشاہ کو سلام کیا اور سکڑی سمٹی ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "کتنا خوب صورت مکان ہے۔ مگر ایک اینٹ کی کمی ہے۔"

کسان یہ سن کر جھنجلا گیا۔ اس نے اتنی محنت سے تو یہ مکان بنایا تھا اور بڑے میاں کہہ رہے ہیں کہ اس میں ایک اینٹ کی کمی ہے۔ وہ بولا۔ "اچھا بابا! اب ان باتوں کو چھوڑو، جلدی سے ہاتھ منہ دھوؤ اور کھانا کھاؤ۔" گھر میں آلو ساگ کی بھاجی پکی تھی۔ بیوی نے سوچا، میاں کا مہمان آیا ہے۔ یہ بُری سی بات ہے کہ وہ دال دلیہ کھائے۔ اس نے جھٹ دڑبے میں سے ایک مرغی نکالی، کسان نے اسے حلال کیا اور بیٹی نے جھٹ پٹ بھون کر دستر خوان پر رکھ دی۔

سب ساتھ کھانے بیٹھے۔ بادشاہ نے مرغی کی قاب اپنی طرف کھینچ لی اور اس کا سر کسان کو دیا، ٹانگیں بیوی کو دیں اور بازو لڑکی کی پلیٹ میں ڈال دیے۔ پھر اس نے دل کے چار ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا سب میں بانٹ دیا۔ باقی مرغی سب نے مل کر کھائی۔

کھانے کے بعد بادشاہ نے ہاتھ دھوئے، کلی کی اور بولا۔ "رات کا کھانا کھا کر میں کچھ دیر ٹہلا کرتا ہوں۔ یہ صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ بس آدھے گھنٹے تک آ جاؤں گا۔ دروازہ بند کر لو۔"

"عجیب خبطی بڈھا ہے۔" کسان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "راستے بھر ایسی الٹ سلٹ باتیں کرتا آیا ہے کہ دماغ کی چولیں ہل گئیں۔" یہ کہہ کر اس نے بیوی اور لڑکی کو شروع سے آخر تک ساری باتیں بتائیں۔ لڑکی نے ایک ایک لفظ غور سے سنا اور پھر مسکرا کر بولی۔ "ابا جی، یہ آدمی خبطی نہیں ہے۔ بہت عقل مند شخص ہے۔"

کسان جھلا کر بولا۔ "اری نیک بخت! ذرا سوچ تو۔ ہم دونوں

پیدل جا رہے تھے کہ اس نے مجھ سے کہا۔ "اگر تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو تو تمہیں بھی سواری میں بٹھالوں گا۔ ایسی بات بھلا کوئی عقل مند آدمی کر سکتا ہے؟" لڑکی دھیرے سے مسکرائی اور بولی۔ "اس کا یہ کہنا بالکل صحیح تھا۔ جب کوئی آدمی سفر کرے تو تھوڑا فاصلہ بھی کاٹے نہیں کٹتا لیکن اگر دو آدمی ساتھ چلیں اور باتیں کرتے جائیں تو لمبا سفر بھی کم معلوم ہوتا ہے۔ سواری میں بٹھانے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ آؤ، میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلو، تمہیں تکان محسوس نہ ہوگی اور تم یوں سمجھو گے، جیسے کسی سواری میں جا رہے ہو۔" کسان نے حیرت سے اپنی لڑکی کی طرف دیکھا، کچھ دیر سر کھجایا اور پھر بولا۔ "خیر چلو، یہ بات میں مان لیتا ہوں لیکن جنازے کو دیکھ کر اس نے یہ کیوں کہا کہ یہ مردہ ہے یا زندہ؟"

"یہ بات بھی حکمت سے خالی نہیں۔" لڑکی نے کہا۔ "نیک آدمی مرنے کے بعد جنت میں جاتا ہے جہاں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ برا آدمی جہنم میں جاتا ہے جہاں وہ مر گیا سمجھو۔ جنازے کو دیکھ کر اس نے یہ معلوم کیا تھا کہ یہ شخص جنت میں گیا یا جہنم میں۔ اس کے جواب میں آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ اگر اس کے اعمال اچھے ہیں تو یہ زندہ ہے اور اگر برے ہیں تو مردہ۔"

کسان یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اچانک اسے ایک اور خیال آیا، بولا۔ "چلو، یہ بات بھی تمہاری درست ہے لیکن اس نے کھڑی فصل کو دیکھ کر یہ کیوں دریافت کیا کہ یہ کٹی ہوئی یا بن کٹی؟"

"بات یہ ہے، ابا جی!" لڑکی نے کہا۔ "بعض کسان فصل پکنے سے پہلے ہی اسے بیچ دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کھیت کے مالک نے اپنی کھڑی فصل بیچ دی ہو۔ اس صورت میں اس کے لیے تو وہ کھیت کٹ چکا اور اس نے اس کے دام بھی وصول کر لیے۔"

کسان نے چور نظروں سے اپنی لڑکی کی طرف دیکھا، کچھ دیر اپنا سر دھنا اور پھر بولا۔ "ہو سکتا ہے تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہو لیکن اس نے میرے مکان کے بارے میں یہ کیوں کہا کہ مکان تو بہت خوب صورت ہے، مگر اس میں ایک اینٹ کی کمی ہے؟"

لڑکی کچھ جھجکی، پھر شرما کر بولی۔ "یہ بات اس نے مکان کے بارے میں نہیں کہی تھی۔ میرے بارے میں کہی تھی۔ میرا آگے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے اور جب میں بات کرتی ہوں تو یہ کھڑکی صاف دکھائی دیتی ہے۔ مکان میں ہوں اور اینٹ میرا دانت۔"

کسان کو قائل کرنے کے لیے یہی باتیں کافی تھیں مگر وہ آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا، بولا۔ "اچھا یہ بتاؤ، اس نے مرغی کو اس عجیب طریق سے کیوں تقسیم کیا؟ مجھے اس کا سر دیا، تمہاری ماں کو ٹانگیں اور تمہیں بازو۔ پھر اس نے دل کے چار ٹکڑے کیے اور ایک ایک ٹکڑا سب میں بانٹ دیا۔"

"میں آپ کو بتاتی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ "اس نے آپ کو سر اس لیے دیا کہ آپ اس گھر کے سردار ہیں۔ اس نے اماں کو ٹانگیں دیں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ انہیں گھر کے کام کاج کے لیے ہر وقت مستعد رہنا چاہیے۔ مجھے بازو دیے۔ اس سے اس کا یہ منشا تھا کہ میں کام دھندے میں اپنے ماں باپ کی مدد کروں۔ آخر میں اس نے ہم سب کو دل کا ایک ایک ٹکڑا دیا۔ اس سے وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہماری دنیا دکھوں سے بھری ہوئی ہے اور ان دکھوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں مضبوط دل کی ضرورت ہے۔"

بادشاہ دروازے سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ لڑکی نے بات ختم کی تو اس نے کنڈی کھڑکائی۔ کسان نے دروازہ کھولا اور بولا۔ "میاں جی، آپ تو کوئی بہت پہنچے ہوئے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "ہم تمہارے بادشاہ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ جس ملکہ کی ہمیں تلاش تھی، وہ آج ہمیں مل گئی۔" یہ کہہ کر اس نے کمر سے بندھی ہوئی تھیلی کھولی، اس میں سے سونے کی سو اشرفیاں نکالیں اور کسان کو دے کر بولا۔ "ان سے لڑکی کے لیے کپڑے لتے اور گہنے پاتے کا بندوبست کرو۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد ہم بارات لے کر آئیں گے اور اب ما بدولت تشریف لے جا رہے ہیں۔"

کسان اور اس کی بیوی بیوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا بیداری!

ٹھیک ایک ہفتے بعد شاہی بارات آئی۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ تین دن تک اس چھوٹے سے گاؤں میں ایسی گہما گہمی، چہل پہل رہی کہ بڑے سے بڑے شہر میں کیا ہو گی۔ دور دور تک کے گاؤں کی دعوت کی گئی اور اتنی دولت لٹائی گئی کہ ہیں ہیں کوس تک کوئی غریب نہ رہا۔

☆☆☆

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

(مریم صدیقہ، گوجرانوالہ)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

(اریب ندیم، ماہین ندیم)

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

(ثمیرہ عمران، لاہور)

اے خدا! شکوہ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

(محمد نعیم امین، لاہور)

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

☆☆

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(ہمایوں رشید، اسلام آباد)

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

(حذیفہ، ابرار الحق، ربوہ جنگ)

مومن تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

(ایمان زہرہ، لاہور)

جنت خود بہ خود ترسے گی تیرے وجود کو اقبالؔ
ذرا چل کر تو دیکھ میرے نبیؐ کے نشانِ قدم پر

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

(نمرہ عبدالحق، لاہور)

ماں مجھے اپنے آنچل میں چھپا لے
گلے سے لگا لے کہ اور میرا کوئی نہیں

(عالیہ حسین راجپوت، ستیانہ بنگلہ)

انسان کی عظمت کو ترازو میں نہ تولو
انسان تو ہر دور میں انمول رہا ہے

☆☆

اس دورِ ترقی میں بھی ذہنوں کے اندھیرے
خورشیدِ رسالتؐ کی ضیاء مانگ رہے ہیں

(ثمرین فاروق، گوجرانوالہ)

سجدہ عشق ہو تو عبادت میں مزہ آتا ہے
خالی سجدوں میں تو دنیا ہی بسا کرتی ہے

(صبا انور، فیصل آباد)

ہم کون ہیں، کیا ہیں، بخدا یاد نہیں
اپنے اسلاف کی کوئی بھی ادا یاد نہیں

(محمد قمر الزمان، خوشاب)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

(ثمر خان، بھکر)

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

(محمد احمد، پنچ وٹلی)

اَلْمُنْتَقِمُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بدلہ لینے والا)

اَلْمُنْتَقِمُ جلّ جلالہٗ اپنے نافرمان بندوں کو ان کے ناپسندیدہ کاموں پر سزا دیتے ہیں۔

جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں آ جائے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے، تب اللہ تعالیٰ اس پر سزا دیتے ہیں۔

دنیا میں بہت سے عجیب و غریب واقعات ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ایسے سرکش انسانوں سے انتقام لیا۔ جیسے فرعون جس نے اپنے آپ کو خدا کہا۔ وہ پانی میں غرق ہوا۔

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کی کوشش کی۔ اس کے دماغ میں ایک مچھر جا گھسا، وہ مچھر سے مرا۔ قارون جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی، وہ زمین میں دھنسا اور قیامت تک وہ اپنے مال کے ساتھ دھنستا ہی چلا جائے گا۔ ہلاکو خان دنیا کا بہت بڑا ظالم گزرا ہے، وہ پاگل ہو کر مرا۔ ہٹلر بھی بڑا ظالم تھا، اس کا انجام بھی بہت برا ہوا۔ ہمارے دو بڑے دشمن ہیں، ایک شیطان اور دوسری بے جا خواہش۔ ہم ان سے انتقام لیں، بدلہ لیں۔ اگر کسی کا دل چاہا کہ وہ جھوٹ بول کر کوئی چیز حاصل کر لے...... امتحان میں سوال کی نقل کر لے...... کسی سے پوچھ کر جواب حل کر لے تو ایسے موقع پر اپنے دل سے بدلہ لیا جائے، اسے سزا دی جائے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ دل میں آنے والی بات کے خلاف عمل کیا جائے۔

ساڑھے نو سو سال

پہلے زمانے میں پانچ نیک آدمی تھے۔ قرآن کریم نے ان کے نام "وَدّ، سُوَاع، یغوث، یعوق، نسر" بتائے ہیں۔

وقت اپنی رفتار چلتا رہا۔ جس طرح ہر چیز کو ختم ہونا ہے، اسی طرح یہ پانچ نیک آدمی اس دنیا سے انتقال فرما گئے۔ ان پانچوں کے انتقال کے بعد لوگ ان کی قبروں پر آ کر روتے اور ان کی یاد میں باتیں کرتے، محفلیں جماتے۔ شیطان نے جا کر انہیں مشورہ دیا کہ تم ان پانچوں کی تصاویر بنا کر اپنے اپنے گھر لگا لو، اس سے تمہیں روزانہ ان کی قبروں پر آنا بھی نہیں پڑے گا اور اپنے گھروں میں تم ان کی یاد کر سکو گے۔

لوگوں نے شیطان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تصاویر بنا کر اپنے اپنے گھروں میں آویزاں کر دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی

عقیدت میں اضافہ ہونے لگا۔ ان کے بعد آنے والی نسل نے عقیدت میں بڑھتے ہوئے ان کے بت بنا کر ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ ان بتوں کو خدا بنا لیا۔ ان بتوں کے سامنے اپنی حاجت رکھتے۔ ان بتوں سے مدد مانگتے اور پھر یہیں سے دنیا میں بت پرستی کی ابتداء ہوئی۔

جب کسی قوم میں بگاڑ آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی شروع ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو دنیا میں بھیجتے ہیں۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت نوح علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ساڑھے نو سو سال لوگوں میں تبلیغ کی۔ حضرت نوح علیہ السلام دن رات لوگوں کو نرمی کے ساتھ ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے اور بت پرستی چھوڑنے کو کہتے اور یہ بھی فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ ان کے لمبے قد کا آدمی تقریباً چھ سو گز کا تھا اور سب سے چھوٹے قد کا آدمی تقریباً ساٹھ گز کا ہوتا تھا اور ان کے سر کسی بڑے قبے سے کم نہ ہوتے تھے۔ ان نعمتوں کا شکر تو یہ تھا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے، مگر انہوں نے بتوں کی پوجا شروع کر دی اور نوح علیہ السلام کو جھٹلاتے اور جب وہ دعوت دیتے تو یہ بھاگتے اور کانوں میں انگلیاں ڈالتے۔ ان کا اور ایمان والوں کا مذاق اُڑاتے، گالم گلوچ کرتے اور قتل کی دھمکیاں دیتے، یہاں تک حضرت نوح علیہ السلام کو مجنون کہہ دیتے۔

حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے بہت ہی کم افراد تھے اور ایمان لانے والوں میں اکثر لوگ غریب تھے۔ جب بھی نوح علیہ السلام اپنی قوم کو دعوت دیتے تو قوم کے مال دار لوگ کہتے کہ ہم تو تمہاری بات نہیں مانتے، کیوں کہ تمہارے ماننے والے تو بہت ہی کم اور غریب لوگ ہیں۔ ان کی سرکشی بڑھتی رہی اور نافرمانی کرتے رہے۔ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول کا مذاق اڑاتی ہے اور مقابلے پر آ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی ان کے مقابلے پر آ جاتے ہیں اور عبرت کے لیے انہیں سزا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے عذاب کا فیصلہ فرما لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی مسجد کے دروازے پر ہی ایک تندور تھا جس میں روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک کشتی بنانے کا حکم فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی تو آپ کی قوم اس بات کا بھی مذاق اُڑانے لگی کہ پانی کا کہیں نام و نشان نہیں ہے اور یہ کشتی بنا رہے ہیں۔

جب کشتی تیار ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو فرمایا کہ جب تندور جوش مارنے لگے تو سمجھو کے ہمارا عذاب شروع ہو جائے گا۔ اس وقت تمام قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا یعنی نر اور مادہ کشتی میں بٹھا لینا، اسی طرح وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، انہیں بھی سوار کر لینا۔ جب تنور اُبل پڑا، جس کی اللہ تعالیٰ نے نشان دہی فرمائی تھی تو حضرت نوح علیہ السلام ایمان والوں کو اور پرندوں کا ایک ایک جوڑا لے کر اس میں سوار ہو گئے اور پھر طوفان شروع ہو گیا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ شروع ہو گئے، بستیاں اُلٹ پلٹ ہونا شروع ہو گئیں اور لوگ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ موسلا دھار بارشیں ایسی شروع ہوئیں کہ زمین پر ہر جگہ پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ ہر چیز ڈوبنے لگی، اللہ تعالیٰ کے تمام نافرمان پانی میں غرق ہو کر ہلاک ہو گئے۔ اس طرح اَلْمُنْتَقِمُ جَلَّ جَلَالُہٗ نے نافرمانوں کو عبرت ناک سزا دی۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی فرمایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں بیٹھنے والوں کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ کا آسمان کو حکم ہوا کہ بارش برسانا بند کر دے تو بارش تھم گئی اور زمین کو حکم دیا کہ سارا پانی جذب کر لے تو پانی سے بھری زمین بالکل خشک ہو گئی اور سب ایمان والوں نے پھر سے سلامتی کے ساتھ زمین پر قدم رکھا۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَبِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ.

ترجمہ: اے اللہ! میں آپ کے غصے سے پناہ مانگتا ہوں آپ کے راضی ہونے کے ساتھ اور آپ کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں آپ کی معافی کے ساتھ۔

☆☆☆

''کیا آپ کے خیال میں اس ملک کا کچھ ہو سکے گا؟'' عمر یعقوب نے چائے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''جس ملک کے حکمران اور قوم سو چکی ہو، اس کا کیا بن سکتا ہے؟'' شیخ محمد عیسیٰ نے مایوسی سے کہا اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس ملک کے مستقبل کے حوالے سے بہت فکر ہے۔ معلوم نہیں اس کا کیا بنے گا۔ ہمارے بزرگوں نے اس ملک کی بنیاد اپنے خون سے رکھی ہے اور...... اور ہم ان کے خون کا یہ صلہ دے رہے ہیں؟ ہم کب تک یوں بے فکری کے عالم میں بیٹھے رہیں گے؟''

''آپ درست کہتے ہیں۔'' عمر یعقوب نے بسکٹ کھاتے ہوئے کہا۔ ''جو قوم اپنے ماضی سے بے فکر، حال سے بے نیاز اور مستقبل کے حوالے سے بے خبر ہو تو تاریخ گواہ ہے کہ قدرت بھی اس قوم کی مدد نہیں کرتی ہے۔ قدرت اسے زیادہ دیر تک آزادی کے جھنڈے نہیں لہرانے دیتی۔ اب ہماری قوم کو بیدار ہو جانا چاہیے۔'' شیخ محمد عیسیٰ نے پھر جوش سے کہا۔

''جی...... جی میں آپ کی تائید کرتا ہوں۔'' عمر یعقوب نے اپنی بے زاری کو چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ بظاہر اس گفتگو کو نہایت دل چسپی سے سن رہے تھے مگر بے زار۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو اپنے ضمیر کو لوریاں دے کر سلا دیتے ہیں۔ انہیں اس ملک کے ماضی، حال اور مستقبل سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ حرام کمائی کے نوٹوں کو گننے کے عادی ہو جائیں ان پر ایسی جذباتی باتیں اثر نہیں کرتی ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹا ان کے درمیان یونہی گفتگو ہوتی رہی، پھر محمد عیسیٰ اپنے گھر چلے گئے اور عمر یعقوب اپنے کمرے میں سونے کی غرض سے لیٹ گئے۔

رات کے دس بجے عمر کے تمام افراد کھانا کھانے میں مصروف تھے سوائے ان کے بڑے بیٹے ابوبکر کے۔

''ارے ابوبکر کہاں ہے؟'' عمر یعقوب نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

''ابا! وہ اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے گیا ہوا ہے۔'' ان کی چھوٹی بیٹی علینہ نے برگر کھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اتنی رات گئے...... اب تک تو اسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔'' انہوں نے فکر کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا آپ کو؟ بچہ ہے اپنے دوستوں کے ساتھ موج مستی کر رہا ہوگا۔'' ان کی نخریلی بیوی جویریہ نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔

"بچہ......؟ وہ اب اٹھارہ انیس سال کا نوجوان لڑکا ہے۔" عمر یعقوب نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی، عمر نے اپنے نوکر عادل کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ وہ بھاگا گیا، دروازہ کھولا تو سامنے تھکا ہارا ابوبکر کھڑا تھا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے!" اس نے غصے سے کہا اور نوکر سامنے سے ہٹ گیا۔

ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے ابوبکر نے ایک نظر صوفے پر بیٹھے عمر یعقوب پر ڈالی پھر نہایت تھکے لہجے میں کہا۔

"گڈ نائٹ ڈیڈ۔"

"ادھر آؤ...... میں نے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔" عمر یعقوب نے غصے سے کہا۔

"ڈیڈ صبح بات کر لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا مگر عمر یعقوب کی رعب دار آواز نے اسے روک لیا۔ "میں نے کہا تم ادھر آؤ!" یہ سن کر ابوبکر ہانپتا کانپتا اپنے والد کے روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم آج رات اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟" عمر یعقوب نے قہر آلود نگاہ اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کے چار بجے سے غائب ہو اور اب رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو؟"

"ابا جان! کہیں آوارہ گردی نہیں کرتا۔ پہلے میں نے مووی دیکھی، پھر میں اپنے دوست کی سال گرہ پر چلا گیا۔" ابوبکر نے کہا۔ "تمہارے امتحانات کب ہیں؟" "ایک ہفتے بعد۔"

"پھر بھی تم سیر سپاٹے کر رہے ہو......؟ تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"ابا...... پاس تو ہو جاتا ہوں ناں......!"

"کیا پاس ہونا ہی کافی ہے......؟ پاس بھی میں سفارشوں سے کرواتا ہوں۔" انہوں نے نہایت غصیلے لہجے سے کہا۔

"اچھا! اب پڑھ لوں گا۔" اس نے بے زاری سے کہا اور چلا گیا۔

"پتا نہیں اس لڑکے کا کیا ہو گا؟ دن بہ دن بگڑتا ہی جا رہا ہے۔" انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

☆☆

عمر یعقوب ایک بہت امیر آدمی تھے۔ ان کی تین اولاد تھیں، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ لڑکے کا نام ابوبکر، لڑکیوں کے نام علینہ اور اسماء تھا۔ تینوں بچے نہایت ہی خودسر اور بدتمیز تھے۔ عمر یعقوب کو بھی یہ بات نہ سمجھ آ سکی کہ اس کی اولاد کیوں اتنی نالائق، بے فکر اور بدتمیز ہے۔ اسے یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس کے گھر کی یہ بے برکتی اس کی حرام کمائی کی وجہ سے ہے۔ اس کے والد نہایت ہی نیک آدمی تھے۔ انہوں نے عمر یعقوب کو نہایت اچھی تعلیم و تربیت سے نوازا مگر دولت کی ہوس نے اسے اندھا کر دیا۔ اس نے نہایت اونچے خاندان کی خودسر لڑکی سے شادی کی۔ لڑائی اور حرام کمائی سے اس گھر میں ہمیشہ بے برکتی رہی۔ اتنا بڑا گھر ہونے کے باوجود بھی گھر میں اداسی، وحشت اور ناآسودگی تھی۔

عمر یعقوب کے والدین نے اسے حرام کمائی سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ باپ کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنی طاقت تو تھی نہیں کہ وہ بیٹے کو مارتا اور نہ ہی ماں کے ہاتھوں میں اتنی سکت...... لہٰذا وہ عمر سے الگ ہو گئے۔ اس کی کمائی میں سے ایک روپیہ تک نہ کھایا۔ عمر یعقوب بھی ان کی خیر خبر نہ لینے جاتا۔ کبھی کبھی اس کی اولاد اپنے دادا، دادی سے مل آتی تھی لیکن اب تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔

شیخ محمد عیسیٰ اس کے والد کے پرانے دوست تھے اور بچپن میں عمر یعقوب کے اردو کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ وہ کبھی کبھار آ کر اسے پاکستان سے محبت کرنے کے بارے میں درس دیتے لیکن اس کے کانوں پہ جوں تک نہ رینگتی تھی۔

آخر پانچ سال گزر گئے۔ عمر یعقوب کا بیٹا ابوبکر اب بائیس سال کا ہو گیا تھا۔ ایک رات اچانک عمر یعقوب کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے جا کر دروازہ کھولا تو باہر پولیس کھڑی تھی۔ نوکر نے کافی مزاحمت کی مگر پولیس اندر داخل ہو گئی اور عمر یعقوب کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ابوبکر نے پولیس سے گرفتاری کا سبب پوچھنے کی کافی کوشش کی مگر وہ جب بھی پولیس سے پوچھتا، پولیس افسر سرد لہجے میں کہتے: "یہ تمہیں تھانے جا کر پتا چل جائے گا۔"

تھانے جا کر ان کو پتا چلا کہ عمر یعقوب کو کرپشن کرنے کے جرم میں پکڑ لیا گیا ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد عدالت نے بھی عمر یعقوب کو بیس سال کی قید سزا سنا دی۔ عمر یعقوب کی ساری جائیداد، مکان اور نقد رقم حکومت نے ضبط کر لی کیوں کہ یہ تمام کرپشن کی

کمائی تھی۔

عمر یعقوب کی بیوی اور بچے رل چکے تھے کیوں کہ انہیں پناہ دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ ان حالات میں وہی بوڑھے ماں باپ سہارا بنے جن کا عمر یعقوب نے کبھی خیال تک نہ کیا تھا۔ اب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ نہ عالی شان گھر، نہ جائیداد، نہ مال اور نہ ہی وہ غرور جس میں وہ مست تھے۔

بوڑھے ماں باپ نے اپنی اولاد کے بچوں کو نہایت پیار سے رکھا، محبت و شفقت دی۔ ان کے اس چھوٹے سے گھر میں عالی شان فانوس، صوفے اور بیڈ وغیرہ تو نہ تھے مگر چین، سکون اور ایک نور سا تھا۔

ایک صبح ابوبکر اپنے والد سے تھانے ملنے گیا۔ اپنے والد کو سلاخوں کے اندر دیکھ کر رنجیدہ ہو گیا۔ اس کے والد نے پوچھا۔

"میرے بیٹے! تم کہاں رہتے ہو اب؟ تمہاری ماں، تمہاری بہنیں کیسی ہیں؟"

"ہم سب اب دادا جان کے گھر میں رہتے ہیں۔ امی جان اب خاموش سی ہو گئی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ کچھ پیتی ہیں۔ علینہ اور اسما نہ اب پہلے والی شرارتیں کرتی ہیں نہ ہی ہنسی مذاق۔ دادا دادی ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔" ابوبکر نے افسردگی سے کہا۔

"اور مجھے کوئی یاد کرتا ہے؟" عمر یعقوب نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

"ابا! ہم سب آپ کو یاد کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور پھر بولا۔ "ابا! ہمیں آپ سے ایک شکایت ہے۔"

"مجھے معلوم ہے وہ شکایت کیا ہے۔" عمر یعقوب اب کسی بلکتے ہوئے بچے کی طرح رونے لگے جو اپنی ماں سے جدا ہو جاتا ہے۔ وہ تھوڑا سا ٹھہر کر بولے۔ "میں نے تمہیں کبھی بھی دین کے بارے میں نہ بتایا نہ کبھی رسولؐ کے بارے میں بتایا...... کبھی پاکستان کی اہمیت نہ بتائی...... مجھے معاف کر دو میرے بیٹے!...... میں نا سمجھ تھا کیوں کہ میں نے کبھی اپنے استاد محمد عیسیٰ صاحب کی باتوں کو اہمیت نہ دی۔

میرے بیٹے! میں نے اپنی ماں...... پاکستان کے ساتھ بے وفائی کی ہے...... اب میں اپنی ماں سے معافی کیسے مانگوں؟ مجھے اپنی غلطی پر ندامت ہے...... میرے بیٹے! تم میرے جیسی غلطی نہ کرنا۔ پاکستان کی حفاظت کرنا...... اب تم لوگ ہی اس کے پاسبان ہو۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

ابوبکر کو اب معلوم ہو چکا تھا کہ پاکستان کی کیا اہمیت ہے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ پاکستان ہمارا حصار ہے۔ ہمارا آشیانہ ہے...... پاکستان پاک لوگوں کے رہنے کی جگہ۔

اس واقعہ کو اب آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔ آج چودہ اگست کا دن تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں اس حوالے سے خصوصی تقاریر کا مقابلہ تھا جو صبح کے نو بجے شروع ہونا تھا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک تمام حاضرین، اساتذہ کرام اور جج صاحبان جمع ہو چکے تھے۔ ایک طالب علم نے تلاوت قرآن پاک کی اور پھر ایک نے نعت پڑھی اور پھر مقابلہ شروع ہو گیا۔ ایک مقرر نے تقریر شروع کی:

"محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام اور میرے عزیز ساتھیو! آج مجھے جس موضوع پر لب کشائی کرنے کا موقع ملا ہے وہ

موضوع ہے "پاکستان کا مستقبل" کسی بھی قوم کا مستقبل اس قوم کے نوجوان ہوتے ہیں جو اس قوم کی بنیاد ہیں۔ جن کے ولولے، امنگیں اور امیدیں قوم کو ترقی سے روشناس کراتی ہیں۔ جن کی شمشیریں قلم کی طرح اس قوم کی کتاب کے نئے باب لکھتی ہیں۔ قوم کی جڑیں اس قوم کے نوجوان ہوتے ہیں۔ اگر یہ نوجوان صحت مند ہوں تو درخت (پاکستان) بھی سرسبز ہوگا اور اگر یہی کمزور ہوں گے تو درخت بھی اُجڑ جائے گا۔ پاکستان کا مستقبل پاکستان کے خوددار اور غیرت مند نوجوان ہیں۔

لیکن مایوسی تو یہ ہے کہ آج کے نوجوان میں قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں کا سا جوش و جذبہ نہیں رہا ہے۔

میرے ساتھیوں! ہمارا مستقبل بھی ہمارے پیارے پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ہم نے ابھی بھی اپنی حالت نہ بدلی، اپنی ذمہ داریاں نہ پہچانیں، اپنے ضمیر کو نہیں جگایا تو ہمیں بے انتہا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

میرے ساتھیو! ہمیں زندہ قوم بننا ہے۔ پاکستان کی حفاظت کرنی ہے۔ اس سے غداری نہیں کرنی، اس سے وفا کرنی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اسے بڑی قربانیوں سے حاصل کیا ہے۔ ہمارے شہیدوں نے اپنا خون اس کے حصول کی راہ میں قربان کیا ہے اور اب ان شہیدوں کی روحیں یہ سوال کر رہی ہیں کہ کوئی تو صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، موسیٰ بن ابی غسان اور ٹیپو سلطان اُٹھے اور دُنیا میں اپنی فتوحات کی داستانیں لکھے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے ضمیر کو جگائیں۔ تعلیم اور ترقی پر بھرپور زور دیں۔ علم، انصاف اور اتحاد کا نظام قائم کریں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں کیوں کہ اسی میں ہی ہماری اور ہمارے ملک کی بھلائی ہے۔"

جب اس نوجوان کی تقریر ختم ہوئی تو لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ خاموشی چھا گئی۔ نوجوان کی آواز میں ایسا درد اور اثر تھا کہ حاضرین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور کوئی بھی طالب علم اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ وہی ابوبکر ہے جس کا باپ کرپٹ تھا۔ اب ابوبکر ایک محبِ وطن پاکستانی ہے۔

اب وہ پاکستان کا عاشق ہے، پاکستان کا وفادار شہری ہے کیوں کہ اس نے ماضی سے بہت سبق سیکھ لیا ہے۔ وہ جان گیا تھا کہ ملک کے غدار کبھی خوش و خرم نہیں رہ سکتے۔ ہمارے بزرگوں نے بے انتہا مشکلات سے اپنی جانوں کی قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا ہے۔

ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے

سلسلہ "کھوج لگائیے" میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

عدن سجاد، جھنگ صدر۔ آفتاب عدیل، لاہور۔ عبرین آمین، جھنگ۔ سمیہ خاور، لاہور۔ عارف شیخ، کوٹری۔ زینب ذوالفقار علی، لاہور۔ حافظ محمد مبشر، فیصل آباد۔ محمد قمرالزمان، خوشاب۔ جواد اعجاز، صوابی۔ محمد عثمان علی، حافظ آباد۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ طلحہ زبیر، شمالی وزیرستان ایجنسی۔ محمد حبیب الرحمٰن صدیقی۔ رضوان جابر، ساہی وال۔ احسان جبار، قصور۔ حارث زمان، کرک۔ حاویہ گل، لاہور۔ آمنہ تبسم، لاہور۔ فاتحہ منیر، فیصل آباد۔ مغیث الرحمٰن، گوجرانوالہ۔ حافظ محمد آصف لطیف، گوجرانوالہ۔ سید شہریار علی، لاہور۔ محمد عبداللہ ثاقب، گوجرانوالہ کینٹ۔ کرن فاروق، گوجرانوالہ۔ محمد جسیم خان، کہوٹہ۔ مشعل احمد، گجرات۔ رانا کلیم، بھکر۔ محمد ضیا اللہ، میاں والی۔ حنا مجید، پشاور۔ صائم حسن خان، میاں والی۔ عابد رحمان، لاہور۔ شیخ محمد شارق، خوشاب۔ جنان غنی فرزند علی، لاہور۔ معیز اعتزاز، اٹک۔ ایمان یاسر، سیال کوٹ۔ محمد حسن علی شاہ، پشاور۔ ذیشان اقبال، لاہور۔ مریم کاشف، حیدرآباد۔ رمشا کنول، چک جھمرہ سٹی۔ دانیا آصف، گجرات۔ محمد مصعب، راولپنڈی۔ صائمہ شہزادی، لاہور۔ خرم اقبال، سرگودھا۔ کاشف رضا، بھکر۔ اریج یٰسین، فیصل آباد۔ محمد عائش رضا، لاہور۔ محمد حذیفہ فارانی، اسلام آباد۔ سید محمد علی حسن، لاہور۔ حریم طاہر، لاہور۔ شیزہ شاہد، لاہور۔ زینب حسن، پشاور۔ عائشہ سمیع، کراچی۔ ایمان زہرہ، لاہور۔ عزام عبداللہ، لاہور۔ سنان علی، جہلم۔ سحر فاطمہ، لاہور۔ محمد شہباز صدیق بٹ، لاہور۔ سلیمان علی اعوان، واہ کینٹ۔ شہران سردار، ساہی وال۔ حافظ محمد احمد، فیصل آباد۔ رامین نصرت، بہاول پور۔ مزمل علی جعفری، جھنگ۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ عروج فاطمہ، راولپنڈی۔ محمد حذیفہ خان، پشاور۔ محمد طاہر حسن، لاہور۔ سلیمان علی اعوان، راولپنڈی۔ محمد عمیر، فیصل آباد۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ ہیرے میں کون سا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے؟

i۔ زنک سلفائیڈ ii۔ کاربن iii۔ چونا

2۔ ہائیڈرومیٹر آلے سے کون سی چیز ناپی جاتی ہے؟

i۔ جگ کا درجۂ حرارت ii۔ آگ کا درجۂ حرارت iii۔ جسم کا درجۂ حرارت

3۔ بلوچستان کا دروازہ کس شہر کو کہتے ہیں؟

i۔ کوئٹہ ii۔ چمن iii۔ زیارت

4۔ پانی کی ملکہ کس پودے کو کہا جاتا ہے؟

i۔ کنول ii۔ واٹرلِلی iii۔ گلاب

5۔ خون کا گودام جسم کے کس عضو کو کہا جاتا ہے؟

i۔ معدہ ii۔ تلی iii۔ گردے

6۔ نمازِ خسوف کب پڑھی جاتی ہے؟

i۔ وبا پھیلنے پر ii۔ چاند گرہن کے وقت iii۔ سورج گرہن کے وقت

7۔ "Arena" کس کھیل کے پلے گراؤنڈ کا خاص نام ہے؟

i۔ ریسلنگ ii۔ کبڈی iii۔ ہاکی

8۔ پاکستان کا کون سا صوبہ دو شہروں کے درمیان میں ہے؟

i۔ مردان ii۔ ٹیکسلا iii۔ جہلم

9۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار کہاں ہے؟

i۔ تہران ii۔ شام iii۔ قسطنطنیہ

10۔ چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ شعر علامہ اقبالؒ کی کس نظم سے لیے گئے ہیں؟

i۔ وطنیت ii۔ ترانۂ ملی iii۔ شمع

جوابات علمی آزمائش جولائی 2014ء

1۔ پوٹینشل توانائی 2۔ سنی جانے والی بات 3۔ رد کفر 4۔ کالی 5۔ یاسمین 6۔ یمن 7۔ لنک 8۔ منڈی بہاؤالدین 9۔ سعودی عرب 10۔ مولانا روم

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ مرزا ہادی بیگ، حیدر آباد (150 روپے کی کتب)

☆ محمد حذیفہ فارانی، اسلام آباد (100 روپے کی کتب)

☆ حارث زمان، کرک (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:

سفیان علی اعوان، راول پنڈی۔ ایمان زہرہ، لاہور۔ عرش علی جعفری، جھنگ۔ عروج فاطمہ، راول پنڈی۔ سنان علی، جہلم۔ احمد آصف، گجرات۔ کاشف رضا، بھکر۔ محمد قمرالزمان، خوشاب۔ رافع شیخ، کوٹری۔ گل رخ قیوم، لاہور۔ معیز اعتزاز، اٹک۔ عثمان غنی، فرزند علی، لاہور۔ حارث نعیم، لاہور۔ فاتحہ میر، فیصل آباد۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ ہادیہ گل، لاہور۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ سید شہریار علی، لاہور۔ احسان جبار، قصور۔ ملیحہ شمشاد، لاہور۔ محمد حسیم خان، کوہاٹ۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ اقصیٰ سجاد، راول پنڈی۔ عروبہ وسیم، کراچی۔ مطیع الرحمان، لاہور۔ محمد حماد قادری، محمد شاد زیب قادری، کاموکی۔ آمنہ رمضان، فیصل آباد۔ سید محمد علی حسن، لاہور۔ شمیم عالم، اوکاڑہ۔ محمد عبدالرحمٰن میر، پشاور۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ شیزہ شاہد، لاہور۔ نایاب آفریدی، پشاور۔ در شہوار قربان علی، لاہور۔ عزام عبداللہ، لاہور۔ عثمان ذوالفقار، لاہور۔ اسامہ بن طاہر، منڈی بہاؤالدین۔ ملائکہ رانی، جھنگ صدر۔ حورین امین، جھنگ صدر۔ آفتاب عدیل، لاہور۔ شیریں جمیل، لاہور۔ انشراح سلیم، لاہور۔ رانا کلیم، حافظ آباد۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ صائمہ شہزادی، لاہور۔

☆☆☆

نانی اماں (ایمن سے): "تم بلی کی دم کیوں کھینچ رہی ہو۔"
ایمن: "نانی اماں! میں نے تو صرف بلی کی دم پکڑی ہے۔ کھینچ تو وہ خود ہی رہی ہے۔"

☆

شاگرد: "کیا کسی کو اسے کام پر سزا مل سکتی ہے جو اس نے نہ کیا ہو؟"
استاد: "نہیں۔"
شاگرد: "شکریہ! آج میں نے گھر کا کام نہیں کیا۔"

(مہرین ایمن، جھنگ)

چور نے کنجوس آدمی کے سر پر پستول تانتے ہوئے کہا: "جان دیتے ہو یا مال؟"
کنجوس کانپتے ہوئے بولا: "جان لے لو۔ مال تو میں نے بڑھاپے کے لیے رکھا ہے۔"

(عبدالمومن ادریسی، علی پور)

جج: "میں تمہیں پھانسی کی سزا سناتا ہوں۔"
ملزم: "اوہ خدایا! اس ذلت سے تو موت بہتر ہے۔"

(آسیہ ناز، نوشہرہ)

ایک پولیس والے نے چور کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ اس کے پاس ہتھکڑی نہ تھی۔ چور نے کہا: "آپ یہیں کھڑے رہیں میں ہتھکڑی لے کر آتا ہوں۔"
پولیس والا بولا: "واہ! اس طرح تم کو تو بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ یہیں کھڑے رہو، میں ہتھکڑی لے کر آتا ہوں۔"

☆

ایک آدمی تنگ آ کر بولا: "ایسی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔"
اتنے میں ایک فرشتہ آیا اور کہا: "میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"
آدمی (فرشتے سے): "اب آدمی مذاق بھی نہیں کر سکتا۔"

(شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور)

ساحل سمندر پر ایک صاحب نے خاتون سے کہا: "محترمہ اپنے بیٹے کو روکیے وہ میرے پیٹ میں پانی ڈال رہا ہے۔"
خاتون نے کہا: "جو بچہ پانی پیٹ میں ڈال رہا ہے وہ میرا بچہ نہیں، میرا بیٹا تو وہ ہے جو آپ کے کوٹ کی جیبوں میں ریت ڈال رہا ہے۔"

☆

ایک ڈرائیور اپنے مالک کو بٹھا کر گاڑی کہیں دور لے جا رہا تھا۔ آبادی سے کافی دور نکلنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ مالک نے پوچھا: "کیا ہو گیا ہے؟"
ڈرائیور: "جناب گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ یہ اب آگے نہیں جا سکتی۔"
مالک نے کہا: "تو ٹھیک ہے پیچھے ہی لے چلو، واپس گھر چلتے ہیں۔"

☆

خاتون نے دکان دار سے پرس کی قیمت پوچھی۔
دکان دار نے کہا: "پانچ سو روپے۔"
خاتون نے کہا: "یہ بہت زیادہ ہیں، میں تو دو سو روپے دوں گی۔"
دکان دار کو غصہ آ گیا اور خاتون سے بولا: "جاؤ مفت لے جاؤ میں ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔"
خاتون نے مسکرا کر کہا: "پھر میں ایک نہیں، دو لوں گی۔"

(دُرِ مکنون، گجرات)

ایک دیہاتی شہر آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک حلوائی کڑاہی میں دھار باندھ کر دودھ ڈال رہا تھا۔ دیہاتی چند لمحے دیکھتا رہا، پھر بولا: "بھائی مجھے بھی دو گز دودھ دے دو۔"

(محمد حسنین معاویہ ڈی آئی خان)

استاد (شاگرد سے): "بتاؤ سورج دور ہے یا تمہارا گھر؟"
شاگرد: "جناب میرا گھر۔"
استاد: "وہ کیسے؟"
شاگرد: "جناب دیکھیں، سورج یہاں سے نظر آ رہا ہے لیکن میرا گھر نظر نہیں آ رہا۔"

(جواد اعجاز، صوابی)

ایک چور نے گھر کے مالک کو جگایا اور پوچھا: "سونا کدھر ہے؟"
گھر کے مالک نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا: "پورا گھر خالی پڑا ہے، جہاں مرضی سو جاؤ۔"

(مریم عزیز، تربیلہ)

طلحہ صاف ستھرے صحن میں چٹائی بچھا کر اپنے اردگرد کتابیں بکھیرے چھٹیوں کا کام کرنے میں مصروف تھا۔ چند صفحات لکھنے کے بعد اس نے صفحہ پلٹا ہی تھا کہ اسی لمحے عین ان کے پین کے ساتھ ایک موٹا سا جامن آ کر ٹکرایا۔ اس نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اردگرد دیکھا لیکن کسی کو نہ پا کر پھر کام کرنے لگا۔ ابھی اس نے دو سطریں ہی لکھی تھیں کہ پھر ایک جامن اڑتا ہوا آیا اور اس کے سر پر لگا۔ ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ بظاہر کام میں مصروف ہو کر چوکنا ہو گیا۔ اب جوں ہی جامن اس کے سر پر لگا تو اس نے فوراً سامنے دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار کے اس طرف زبیر نے چھپنے کی کوشش کی لیکن چوں کہ طلحہ اسے دیکھ چکا تھا اس لیے وہ ہنستا ہوا دیوار پر چڑھ آیا۔

"اتنی کنجوسی سے کیوں پھینک رہے ہو۔" طلحہ نے ایک کے بعد دوسرا جامن منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اگر جامن پک گئے ہیں تو ایک ایک کر کے پھینکنے کی بجائے مہذب طریقے سے ٹوکری میں ڈال کر دے جاؤ۔" طلحہ نے کتابیں بند کر کے سائیڈ پر رکھیں اور چٹائی پر سے جامن ڈھونڈتے ہوئے بولا۔

"یار جامن تو پک گئے ہیں لیکن امی جان نے ابھی اُتارے نہیں ہیں وہ تو میں خود آج نظر بچا کر درخت پر چڑھ کر تمہارے اور اپنے لیے اُتار لایا ہوں۔" زبیر نے صفائی پیش کی۔

"اگر چچی جان کو پتا چل گیا نا تو وہ تمہاری خوب خبر لیں گی۔" طلحہ نے کتابیں بیگ میں ڈالیں۔ اتنی دیر میں زبیر دیوار سے صحن میں کود آیا تھا۔

"آؤ یار انکل کی دکان پر چلیں۔" طلحہ، زبیر کے ہاتھ سے مزید جامن لیتے ہوئے بولا۔

"اسی لیے تو میں تمہاری طرف آیا ہوں۔" زبیر نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم میری سائیکل باہر نکالو۔" میں یہ بیگ اندر کمرے میں رکھ کر آیا۔ طلحہ بیگ اٹھا کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆

زبیر طلحہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ دونوں آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ان کی آپس میں خوب دوستی تھی۔ گھر بھی دونوں کے ساتھ ساتھ ہی تھے، بس درمیان میں ایک دیوار تھی۔ دونوں ہی ذہین اور پڑھائی میں بھی ہوشیار تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں

دوسرے بچوں کی طرح کمپیوٹر گیمز اور انٹرنیٹ پر وقت ضائع کرنے کی بجائے وہ اپنے فارغ وقت میں اصلاحی کتابوں اور کہانیوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کے اس شوق کا ہی نتیجہ تھا کہ زبیر کے گھر میں دونوں کی ایک چھوٹی سی مشترکہ لائبریری بھی تھی جس میں وہ ہر کتاب اور ناول وغیرہ پڑھنے کے بعد سلیقے سے رکھ دیتے تھے۔ ہر کوئی ان کے اس مطالعے کے شوق کو سراہتا تھا۔

☆☆

گلستان بک شاپ کے عین سامنے وہ دونوں سائیکل سے اتر کر دکان کی طرف بڑھے۔

''السلام علیکم انکل!'' دکان میں داخل ہو کر زبیر نے بلند آواز سے کہا۔

''وعلیکم السلام بیٹا!'' ایک چھوٹے کپڑے سے الماری میں لگی کتابوں سے گرد صاف کرتے ہوئے ادھیڑ عمر آدمی چونک کر پلٹا اور خوش دلی سے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

''انکل! ہمیں اچھی سی کہانیوں کی کتابیں اور کچھ تاریخی واقعات کی کتابیں چاہئیں۔'' زبیر نے تجسس سے کہا۔

''کیوں نہیں بیٹا......'' انکل مسکرائے۔ ''وہ رہیں کہانیوں کی کتابیں......'' انہوں نے انگلی سے ایک الماری کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ اس طرف تاریخی واقعات کی کتابیں ہیں، آپ ان میں سے منتخب کر سکتے ہیں۔'' انکل نے ان کی رہنمائی کی اور دوبارہ کتابوں کی گرد صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ طلحہ اور زبیر کتابوں کو کھول کر دیکھتے اور پھر کتاب کو پلٹ کر اس کی قیمت دیکھتے اور واپس رکھ دیتے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تین کتابیں لیے کاؤنٹر پر آئے۔ انکل کو ان کتابوں کی قیمت ادا کرنے کے بعد وہ شاپر لیے باہر آئے اور سائیکل کی طرف بڑھ گئے۔

ان کے جانے کے بعد گلستان بک شاپ والے انکل وقار کافی دیر تک ان کے بارے میں سوچتے رہے۔ انکل وقار خود بھی پڑھے لکھے اور ادب کی قدر کرنے والے انسان تھے۔ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی انہوں نے یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ آج انکل وقار ان بچوں سے بہت متاثر ہوئے تھے جو آج کے اس دور میں ٹی وی اور کمپیوٹر گیمز میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے مطالعہ جیسا اعلیٰ شوق رکھتے ہیں۔

''اب بچپن میں ان کا یہ حال ہے تو بڑے ہو کر کیا ہو گا۔'' انہوں نے خیر خواہی سے سوچا۔ اسی وقت کوئی گاہک دکان میں داخل ہوا تو ان کی توجہ بٹی۔ وہ فوراً کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن زبیر اور طلحہ انکل کی دکان پر جاتے۔ کچھ کتابیں خریدتے، کچھ کے بارے میں دریافت کرتے۔ انکل بڑی خوشی سے ان سے ملتے، کتابیں ڈھونڈنے میں ان کی مدد کرتے اور کتابوں کی قیمت بھی کسی قدر کم کر دیتے تھے۔ ان کے اسی شوق میں چھٹیاں کب ختم ہوئیں، انہیں پتا ہی نہ چلا۔ اسکول دوبارہ کھل چکے تھے، لیکن اب بھی وہ دونوں ہفتے کی شام کو انکل کی دکان پر کتابیں خریدنے ضرور جاتے تھے۔

ایک دن انکل کی دکان پر اپنی پسندیدہ کتابیں تلاش کرنے کے بعد زبیر نے دو سستی سی کتابیں منتخب کیں کیوں کہ اس کے پاس اتنے ہی پیسے تھے۔ اسی دوران طلحہ کی نظر ایک مشہور جاسوسی ناول پر پڑی۔

''زبیر! وہ دیکھو، وہ ناول جس کی ہمیں تلاش تھی......'' وہ چلایا۔

اسی وقت دکان میں چند گاہک داخل ہوئے انکل ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

''ارے واہ! یہ تو وہی ناول ہے۔'' زبیر خوشی سے اچھلا۔ ''لیکن یار ہمارے پاس تو بس ان دو کتابوں کے پیسے ہیں۔'' اگلے ہی لمحے وہ بے چارگی سے بولا۔

''تو کیا ہوا...... ہم یہ ناول چھپا لیتے ہیں۔'' طلحہ نے سرگوشی کی۔

''اور اگر انکل کو پتا چل گیا تو......؟'' زبیر ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آج دکان پر رش ہے، انہیں پتا نہیں چلنا۔'' طلحہ نے کہا اور ساتھ ہی اس نے ناول اپنی شرٹ میں چھپا لیا اور پھر پہلے کی طرح کتابیں دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کتابیں لیے کاؤنٹر پر آئے۔ انکل سے کتابوں کے پیسے کم کروائے۔ پیسے ادا کر کے وہ دکان سے باہر نکل آئے۔ سائیکل پر بیٹھتے ہوئے زبیر نے شیشے کے دروازے پار انکل کو دیکھا جو پہلے کی طرح گاہکوں میں مصروف تھے۔

☆☆

''ارے تم نے تو کمال کر دیا۔'' گھر آ کر زبیر نے طلحہ کے

ہاتھ سے ناول لیتے ہوئے کہا۔

"دیکھا انکل کو پتا بھی نہیں چلا۔" یہ پانچ سو کا ناول تھا۔ ہم تو خرید ہی نہیں سکتے تھے۔ طلحہ فخر سے بولا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

اگلے ہفتے وہ پھر انکل کی دکان کے باہر موجود تھے۔ ان کے دل میں ہلکا سا ڈر بھی تھا کہ کہیں انکل کو پتا نہ چل گیا ہو۔ دکان میں داخل ہوتے ہی حسب معمول طلحہ نے بلند آواز سے سلام کیا۔ انکل نے بڑی خوش اخلاقی سے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ وہ مطمئن ہو گئے تھے، پھر تو وہ گاہے بگاہے کوئی نہ کوئی کتاب چھپانے لگے تھے۔ وہ دکان میں اس وقت جاتے جب رش ہوتا تاکہ وہ آسانی سے کتاب چھپا سکیں۔ کبھی دونوں میں سے ایک انکل کو باتوں میں لگا لیتا اور دوسرا کتاب ڈھونڈنے کے بہانے کوئی کتاب چھپا لیتا۔

☆☆☆

آج بھی وہ دونوں سائیکل پر بیٹھے گلستان بک شاپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہفتے کی شام کو انکل کی دکان پر رش کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ دکان میں داخل ہو کر زبیر نے سلام کیا۔ انکل الماری میں لگی کتابوں میں سے گاہک کو کوئی کتاب ڈھونڈ کر دے رہے تھے۔ زبیر اور طلحہ کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر انکل نے مسکرا کر حسب معمول سر کو ہلکا سا جھکایا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ اپنی پسند کی کتابیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ وہ دونوں دکان کے دوسرے سرے پر کتابوں کی الماری کی طرف بڑھ گئے۔

"ارے زبیر! وہ دیکھو......"

طلحہ نے زبیر کو کہنی ماری تو وہ سامنے لگا ان کے پسندیدہ ناول کا دوسرا حصہ پڑا تھا۔

"لیکن یار ہمارے پاس تو بہت کم پیسے ہیں۔" زبیر بولا۔

"تو کیا ہوا...... جیسے پہلے تو ہم نے یہ ناول پیسوں کا خریدا تھا۔" طلحہ نے سرگوشی کی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں اشارہ کیا۔ زبیر انکل کے پاس کاؤنٹر پر گیا اور یوں ہی بلاوجہ سامنے لگی کتاب کے بارے میں پوچھنے لگا۔ انکل وہ کتاب نکالنے کے لیے مڑے۔ اسی وقت طلحہ نے ناول اپنی شرٹ میں چھپا لیا اور انکل کے واپس پلٹنے تک وہ پہلے کی طرح کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ انکل نے کتاب نکال کر کاؤنٹر پر زبیر کے سامنے رکھی۔ زبیر نے کتاب کھول کر یوں ہی بلاوجہ چند صفحات پلٹے۔

"نہیں انکل! یہ نہیں چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے زبیر نے وہ کتاب واپس کر دی۔ اتنے میں طلحہ ہاتھوں میں دو چھوٹی سی کتابیں اور ایک سستی ڈکشنری لیے آیا۔

"یہ لیں انکل، ان دونوں کی اور ڈکشنری کی قیمت کاٹ لیجیے۔" طلحہ نے کتابیں اور ڈکشنری انکل کے سامنے کاؤنٹر پر رکھیں۔ انکل نے سو روپے میں سے دس روپے کے دو نوٹ واپس ان کی طرف بڑھائے، انہوں نے انکل کا شکریہ ادا کیا اور دکان

سے باہر آئے۔ گھر آ کر ان کے چہرے خوشی سے تمتمار ہے تھے۔ آج پھر انکل کو پتا نہیں چلا تھا۔ یہ بات ان کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ طلحہ اور زبیر اپنی مشترکہ لائبریری میں آ بیٹھے۔

"لاؤ طلحہ! پہلے میں ناول پڑھوں گا۔" زبیر نے کہا۔

طلحہ نے ناول اس کی طرف بڑھا دیا۔ جوں ہی زبیر نے ناول پڑھنے کے لیے کھولا تو ناول میں سے ایک سفید سی چیز فرش پر آ گری۔ وہ دونوں ایک ساتھ چونکے۔ فرش پر کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر زبیر وہ کاغذ اُٹھانے کے لیے جھکا۔ اس نے کاغذ کھولا۔ پھر دونوں کی نظریں تحریر پر جم گئیں۔ "پیارے بیٹو، طلحہ اور زبیر! تم آج کے اس دور میں مطالعہ کے اس قدر شوقین ہو۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں تمہارے اس شوق کی قدر کرتا ہوں لیکن بیٹا مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ جو طریقہ تم لوگوں نے اختیار کیا ہے وہ درست نہیں۔ یوں بھی کتابیں تو انسان میں اچھی عادتیں پیدا کرتی ہیں، اس کے اخلاق سنوارتی ہیں۔ جب تم لوگوں نے پہلی کتاب چرائی میں تو اسی وقت سے جانتا تھا۔ مجھے تمہاری چرائی ہوئی ساری کتابوں کے نام بھی معلوم ہیں لیکن میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تم لوگوں کو سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا تا کہ تم اس غلط طریقے سے باز آ جاؤ۔"

"یار ہم کتنا غلط کام کرتے رہے ہیں۔ ہم پہلے تو ایسے نہیں تھے، پھر ایک دم ہمیں کیا ہو گیا ہے۔" طلحہ نے شرمندگی سے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اسی وقت زبیر اُٹھا اور اس نے کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھیلے میں رکھنی شروع کر دیں۔

"کہاں جا رہے ہو؟" طلحہ بمشکل بولا۔

"انکل کے پاس کتابیں واپس کرنے۔" زبیر کے لہجے سے شرمندگی عیاں تھی۔

انہی قدموں پر پلٹ کر وہ دونوں دوبارہ سائیکل پر جا بیٹھے۔ دس منٹ کے بعد وہ انکل کی دکان کے باہر تھے۔ شیشے کے دروازے کے پار انہیں دیکھ کر کاؤنٹر کی طرف کھڑے انکل ایک دم مسکرا اُٹھے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ گویا ان لڑکوں نے اصلاح قبول کر لی ہے، انکل نے اطمینان سے سوچا۔

اسی وقت زبیر اور طلحہ اندر داخل ہوئے۔

"السلام علیکم انکل!" دونوں نے سلام کیا اور تھیلا ان کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"انکل! ہم بہت شرمندہ ہیں، دو اصل میں ہم ایسے نہیں ہیں۔ پتا نہیں ہمیں کیا ہو گیا تھا۔" طلحہ نے تمہید باندھی۔

"انکل اب تک ہم نے جتنی کتابیں آپ کو دھوکہ دے کر اٹھائی ہیں ہم وہ واپس کرنے آئے ہیں۔ وہ ساری کتابیں اس تھیلے میں ہیں۔" زبیر نے بات مکمل کر کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

"انکل پلیز، آپ ہمیں معاف کر دیں۔"

دونوں نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ان کے چہروں سے ندامت ٹپک رہی تھی۔ انکل کو بے اختیار ان پر پیار آ گیا۔

"ٹھیک ہے بیٹا...... ٹھیک ہے۔" انکل نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں تو آپ کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ بیٹا! میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔" انکل نے صاف دلی سے کہا۔ غصے ہونے کی بجائے انکل کے یوں ایک دم معاف کر دینے پر دونوں کے چہرے کھل اُٹھے تھے۔

"بہت بہت شکریہ انکل...... یہ رہیں آپ کی کتابیں۔" طلحہ نے تھیلا ان کی طرف کھسکا دیا اور وہ دونوں واپس جانے کے لیے مڑ گئے۔

"اِدھر آؤ بیٹا!" جب وہ دروازے کے قریب پہنچے تو انہیں انکل کی آواز سنائی دی۔ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

"یہ لو یہ کتابیں بھی لے جاؤ!" انکل نے کتابوں کا تھیلا اُٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔

"ہم...... انکل......" طلحہ ہکلا گیا۔

زبیر نے بھی گھبرا کر انکل کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! یہ تمہارا انعام ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ تم لوگ کتابوں سے حاصل کیے گئے علم پر عمل بھی کرو گے اور تمام بُری عادتوں سے بچنے کی کوشش بھی کرو گے۔

طلحہ اور زبیر کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ اپنی بات مکمل کر کے انکل کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"بہت بہت شکریہ انکل!" انکل کے ہاتھ سے تھیلا پکڑتے ہوئے دونوں نے کہا اور مسکراتے ہوئے دُکان سے باہر نکل آئے۔

بچوں کے لیے چند مفید باتیں

☆ بچے کو ہدایت کیجیے کہ وہ راستے میں چلتے وقت درمیانی چال چلے۔ بھاگ کر نہ چلے کیوں کہ تیز رفتاری باعث نقصان ہو سکتی ہے۔ ☆ بچے کو گھر میں اور گھر سے باہر ہمیشہ جوتے پہنا کے رکھیں۔ ننگے پاؤں میں کانٹے، کنکر اور دوسری چیزیں چبھ جاتی ہیں اور پاؤں کو زخمی کرتی ہیں۔ ☆ بچوں کے کپڑے اس قدر ڈھیلے ڈھالے نہ ہوں کہ چلتے وقت ان کو دقت کا سامنا کرنا پڑے اور ان میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کریں۔ ☆ کپڑے بہت تنگ بھی نہ ہوں کہ بچہ کھل کر بھاگ دوڑ اور کھیل نہ سکے۔ ☆ بچے کو بتایئے کہ راستے میں چلتے ہوئے کنکروں اور پتھروں سے بچ کر چلے اور ہو سکے تو انہیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دے۔

☆ سفر میں بچے کی حفاظت کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ ☆ بس یا ٹرین کے سفر میں انہیں تاکید کیجیے کہ وہ کھڑکی سے باہر سر نہ نکالیں اور نہ ہی زیادہ اچھل کود کریں۔ آپ خود بھی بچوں کو وقتاً فوقتاً دیکھتے رہیے کہ وہ کن مصروفیات میں ہیں۔ ☆ سفر میں بچے کے ساتھ ساتھ رہیے۔ اپنی باتوں یا کاموں میں مگن ہو کر اس کی موجودگی کو نہ بھول جائیے۔ اس کو ہر وقت آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ عدم توجہ سے بچہ کوئی نقصان بھی اٹھا سکتا ہے۔ ☆ بس یا ٹرین وغیرہ کی کھڑکی کو بند رکھیں۔ ہو سکے تو کھڑکی کے پاس انہیں نہ بٹھائیں۔ ☆ سفر میں دوسرے بچوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع نہ کریں۔ آپ ان کو مل کر بیٹھنے کا موقع دیں۔

☆ روانہ ہونے سے قبل بچوں کی تمام ضروریات کی چیزیں رکھ لیں تاکہ آپ کو راستے میں پریشان نہ ہونا پڑے۔ ☆ سردیوں کے موسم میں سفر کریں تو بچوں کے لیے زائد کپڑے، گرم ٹوپی، موزے ضرور رکھیں۔ ☆ پانی کا برتن اور دیگر اشیا کو اپنے پاس رکھیں۔ ☆ جب بچے کہیں باہر سے واپس آئیں تو آپ ان کا خیر مقدم کریں اور ان کی پسند کے متعلق، ان کی سیر کے متعلق باتیں کریں۔ بچہ اس طرح بہت اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ ☆ بچہ اگر بیمار ہو جائے تو اس کو حوصلہ دیجیے۔ تسلی دیجیے۔ ان کے سامنے بے صبری کا مظاہرہ نہ کریں۔ ☆ چوٹ لگنے پر اس کی دلجوئی کیجیے اور علاج کروایئے نہ کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیں کہ تم نے یہ کیوں کیا، وغیرہ وغیرہ۔ ☆ غم کی شدت میں ایسی کوئی حرکت نہ کیجیے جس سے ناشکری اور شکایت کا احساس ہو۔ زور زور سے رونا، چیخنا، ماتم کرنا مسلمان کے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ☆ بیماری کو برا بھلا نہ کہیے بلکہ نہایت صبر و ضبط سے کام لیں اور اجر آخرت کی تمنا کریں۔ ☆ بچوں کو موقع دیجیے کہ وہ جائز قسم کی تفریح اور کھیلوں سے جی بہلائیں اور کھل کر خوشی منائیں۔ ☆ بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خود بھی شریک ہوں۔ ☆ بچہ رونے لگے یا ضد کرنے لگے تو پیار سے سمجھایئے یا اس کی توجہ مبذول کروائیں۔ ☆ چھوٹے بچوں کو مسجد میں نہ لے کر جائیں تاکہ وہ نمازیوں کی عبادت میں خلل نہ ڈالیں۔

☆ سمجھدار بچوں کو نماز کا پابند بنائیں اور انہیں مسجد کے آداب سے آگاہ کریں۔ ☆ بچوں میں نماز ادا کرنے کا شوق پیدا کریں اور گھر میں ان کے ساتھ نرمی، محبت اور شفقت کا سلوک کیجیے۔ ☆ وہ اگر کوتاہی کریں یا شرارت کریں تو انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے کے بجائے پیار اور محبت سے سمجھایئے اور بھلائی کی تلقین کیجیے۔

دماغ لڑاؤ

حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2014ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

بوجھو تو جانیں / کھوج لگایئے

حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اگست 2014ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن کے ساتھ پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

[illegible] آخری تاریخ 08 اگست 2014ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

اوجھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

میری زندگی کے مقاصد

بوجھو تو جانیں

1- سفید ہاتھی اور سبز ہے
بتاؤ پہیلی ورنہ جاؤ گھر

2- ہاتھ میں ڈنڈا نہ تلوار
ننھا سا اک چوکی وار
(صفا رشید، کراچی)

3- جب بھی اس کو غصہ آئے
سب کو چھوڑ کر لکڑی کھائے

4- دیکھی ہم نے رات کی رانی
آنکھ سے اس کے ٹپکے پانی
(عدن سجاد، جھنگ)

5- دور دیس سے چل کر آیا
بن بولے سب حال سنایا

6- چڑھے ناک پر پکڑے کان
بچو بولو کون شیطان

7- ایک تھال ہیروں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
موتی اس سے ایک نہ گرے
آنکھ کھلی تو ہیرے غائب
(ملائکہ رانی، جھنگ)

8- سب سے تیز اس کی رفتار
ذہن میں آئے سو سو بار

9- سب کو دیکھے اور پہچانے
کون ہے جو نہ اس کو جانے

10- چلتی جائے ایک کہانی
سو برسوں تک نہ ہو پرانی
(محمد عبداللہ نیازی، بھکر)

راستہ تلاش کریں:

نقطے ملاؤ اور رنگ بھرو:
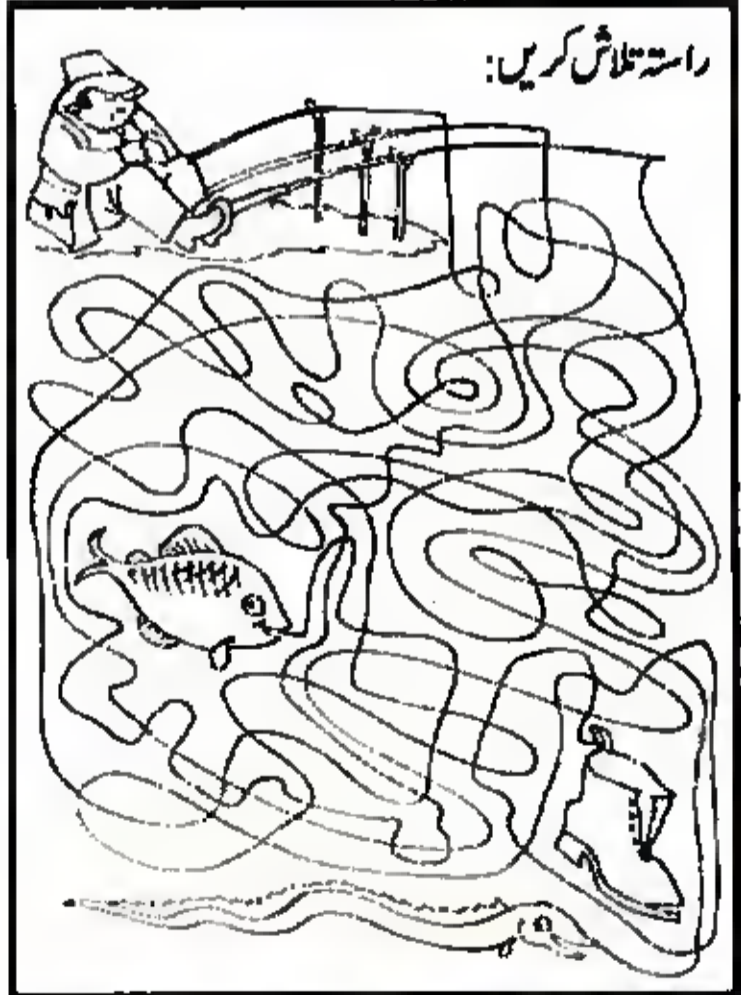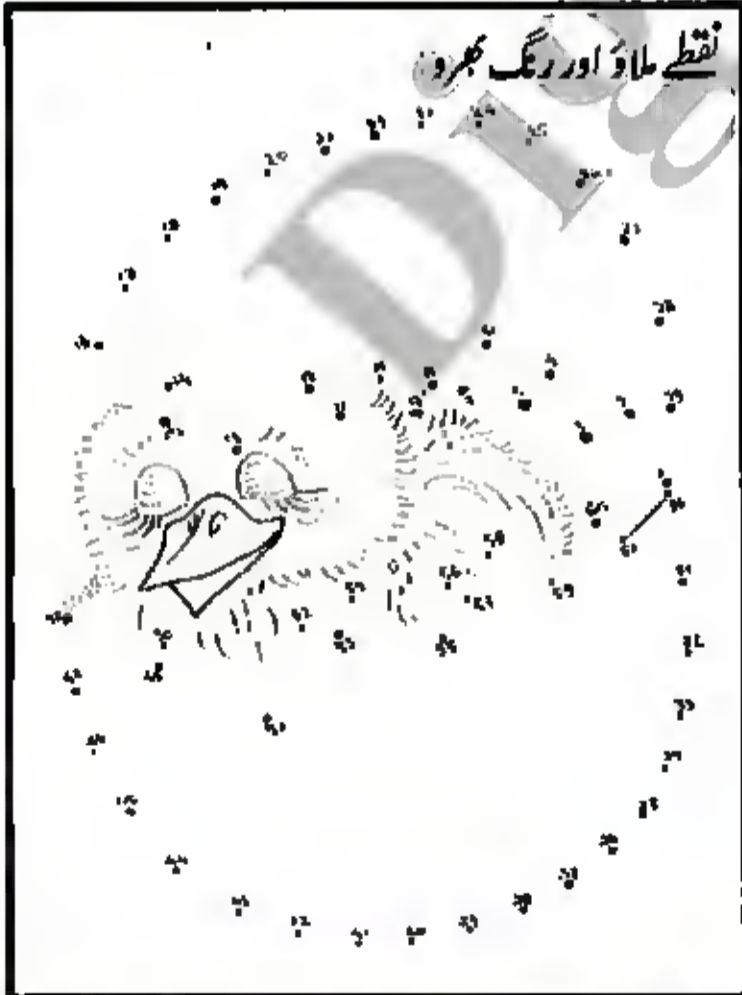
- ڈالر کا پرانا نام تھالر تھا۔
- لاہور شہر کا پرانا نام محمود پور ہے۔
- دُنیا میں ایٹمی دور کا آغاز 14 جولائی 1945ء کو شمالی میکسیکو میں ہوا۔
- مچھلی اور سانپ دو ایسے جانور ہیں جن کی آنکھوں پر پلکیں نہیں ہوتیں۔
- ایک نوری سال ساٹھ کھرب میل (یعنی 6 کے آگے بارہ صفر اور لگایئے) کا ہوتا ہے۔
- سیارے زہرہ (Venus) کو "زمین کی بہن" کہا جاتا ہے۔
- خلا میں سب سے پہلے "فٹ بال" کا کھیل کھیلا گیا۔
- ٹماٹر کو "Love Apple" بھی کہتے ہیں۔
- عام طور پر غوطہ خوروں کا لباس سرخ بنایا جاتا ہے تاکہ وہ شارک سے محفوظ رہیں کیوں کہ شارک کو سرخ رنگ نظر نہیں آتا۔
- بیلے رقص کا آغاز ملک اٹلی سے ہوا۔
- شہر بغداد کی بنیاد خلیفہ المنصور نے رکھی تھی۔
- برصغیر میں تانبے کا سکہ سب سے پہلے سلطان محمد تغلق نے چلایا۔
- ہالینڈ دُنیا کا سب سے نیچا ملک ہے۔
- بانی عمرانیات علامہ ابن خلدون کا مزار قاہرہ میں ہے۔
- دُنیا کی سب سے پہلی خاتون پائلٹ ترکی کی صبیحہ بیگم تھی۔
- مولانا محمد علی جوہر نے آکسفورڈ یونی ورسٹی میں تاریخ کے مضمون کی تعلیم حاصل کی تھی۔
- ابو نصر فارابی مشہور مسلمان موسیقار تھا جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے راگ سے لوگوں کو ہنساتا، رلاتا اور مدہوش کر دیتا تھا۔
- قائداعظم کو سب سے پہلے "قائداعظم" مولانا مظہر الدین نے کہا۔
- قاضی محمد اکبر نے سب سے پہلے قائداعظم کو "بابائے قوم" کا خطاب دیا۔
- شداد نے دُنیا میں اپنی بنائی ہوئی جنت کا نام "ارم" رکھا تھا۔

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

- مسجد نبویؐ کی بلندی 1225 میٹر ہے۔
- مسجد نبویؐ کا احاطہ (ایریا) 82000 مربع میٹر ہے۔
- مسجد نبویؐ کے 2014 ستون ہیں اور ہر ستون میں فاصلہ چھ میٹر ہے۔
- گنبد والے ستون کا فاصلہ اٹھارہ میٹر ہے۔
- حرکت کرنے والے ایک گنبد کا وزن اسی (80) ہے۔
- چھت 67000 مربع میٹر ہے جس پر 90,000 نمازیوں کی گنجائش ہے۔
- صحن 2,35,000 مربع میٹر ہے جس میں 4,30,000 نمازیوں کی گنجائش ہے۔
- اس طرح کُل 6,98,000 نمازیوں کی گنجائش ہے۔

(حافظ محمد فرخ حیات، محمد حبیب صابر جٹ، اوچ گل)

- کوئلے کو بلیک ڈائمنڈ کہا جاتا ہے۔
- مارخور پاکستان کا قومی جانور ہے۔ مارخور سانپ کھاتا ہے، اس لیے اسے مارخور کہا جاتا ہے۔ مارخور فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے سانپ کھانے والا۔
- کپاس اُگانے کے لیے زیادہ مناسب کالی زمین ہوتی ہے۔
- کنگ آف کیمیکلز سلفیورک ایسڈ کو کہا جاتا ہے۔
- پاکستان کا قومی پھل آم ہے اور قومی ڈش بریانی اور نہاری ہے۔
- دنیا میں سب سے پہلے مہندی کا استعمال حضرت ابراہیمؑ نے کیا۔
- پاکستان کی پہلی خاتون سائنس دان ثمینہ ترمذی ہیں۔
- فرانس کی دلہن پیرس کو اور یورپ کی ساس ڈنمارک کو کہا جاتا ہے۔
- میری کیوری خاندان کو 5 نوبل پرائز ملے۔
- اسلامی دُنیا کا سب سے بڑا جنازہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر کا تھا۔

(عاصمہ ہاشمی، لاہور)

اگست کا مہینا تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ گو یا ان دنوں بارشیں بھی ہوتی ہیں لیکن حبس اور لو سے سب بے حال ہو جاتے ہیں۔ آج بھی موسم کا ایک گرم دن تھا۔ قاسم اپنے کام کے سلسلے میں باہر نکلا۔ وہ سارا دن دھوپ میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ گھر آ کر وہ بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑا۔ شدید تھکاوٹ کی وجہ سے بستر پر گرتے ہی وہ گہری نیند میں چلا گیا۔

جب وہ شام کو بستر سے اُٹھا تو سخت بخار میں تپ رہا تھا۔ ابا جان اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد اسے دوا لکھ کر دی تا کہ وہ کسی میڈیکل اسٹور سے خرید کر استعمال کرے۔ ڈاکٹر نے قاسم کو دوائی میں صرف 3 گولیاں دیں اور کہا کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک گولی کھا لینا۔ پیارے بچو! بتائیں قاسم کتنے وقت میں تینوں گولیاں کھائے گا؟
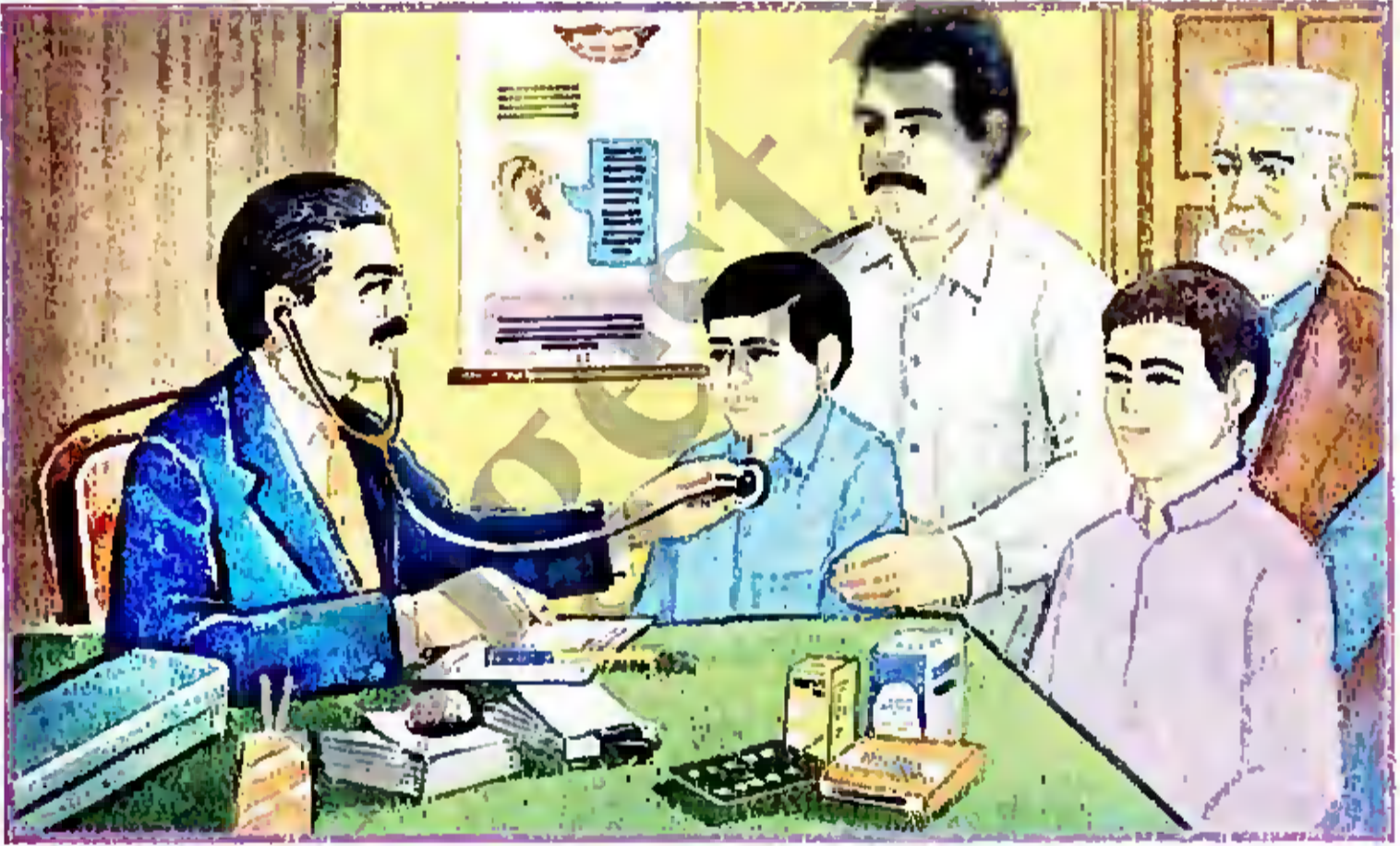
جولائی 2014ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے: 6 بلیاں 70 منٹ میں 60 چوہے پکڑیں گے۔

جولائی 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- رشدہ عدنان، کراچی	2- شمیم عالم، اوکاڑہ
3- افراح اکبر، لاہور	4- سمیہ نوید، لاہور
5- فائزہ بابر خان، راول پنڈی	

14-اگست

سحر کی روشنی کی داستاں ہے
یہ دن میرے ارادوں کی زباں ہے
اسی روشن افق کی جستجو میں
مری پلکوں پہ گردِ کارواں ہے
نظامِ نو ملا ہے زندگی کو
نئی فکر و عمل پیہم رواں ہے
سماعت آہٹوں سے پوچھتی ہے
مرا رہبر مرا قائد کہاں ہے
علَم ہاتھوں میں ہو علم و عمل کا
یہی آزاد قوموں کا نشاں ہے
مری آنکھوں میں آنسو ہیں خوشی کے
مری خوشیوں میں غم کی داستاں ہے

کرامت بخاری

آزادی کا پہلا دن

غلام حسین میمن

14 اگست 1947ء کی رات ٹھیک بارہ بجے ریڈیو پاکستان لاہور سے پہلے انگریزی اور پھر اُردو میں یہ اعلان نشر ہوا۔ "یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے۔" انگریزی میں یہ اعلان ظہور آزر نے اور اردو میں مصطفیٰ علی ہمدانی نے کیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد مولانا طاہر القاسمی نے قرآن مجید کی سورہ فتح کی آیات تلاوت فرمائیں جس کے بعد ان کا ترجمہ نشر کیا گیا۔ بعدازاں خواجہ خورشید انور کا مرتب کیا ہوا خصوصی سازینہ بجایا گیا۔ پھر قوالی میں علامہ اقبال کی نظم "ساقی نامہ" کے چند بند پیش کیے گئے۔ اس نشریات کا اختتام حفیظ ہوشیار پوری کی ایک تقریر پر ہوا۔

آدھی رات کے وقت ہی ریڈیو پاکستان پشاور سے اُردو میں آفتاب احمد اور پشتو میں عبداللہ جان مغموم نے قیامِ پاکستان کا اعلان کیا۔ اس کے بعد تلاوت کلام پاک کی گئی جس کا شرف قاری فدا محمد نے حاصل کیا۔ اس نشریات کا اختتام احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے نغمے پر ہوا جس کے بول تھے۔

"پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو۔"

واضح رہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں تین ریڈیو اسٹیشن آئے تھے۔ ان میں لاہور، پشاور اور ڈھاکہ تھے۔ ڈھاکہ اب موجودہ بنگلہ دیش میں ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ مشرقی پاکستان کے نام سے پاکستان کا حصہ تھا۔ ریڈیو ڈھاکہ سے ایسا ہی اعلان انگریزی میں کلیم اللہ نے کیا جس کا بنگلہ زبان میں ترجمہ نشر کیا گیا۔

اس سے قبل 14 اگست 1947ء کی صبح نو بجے نئے آزاد ہونے والے ملک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی آزادی اور اقتدار کی منتقلی کا اعلان کیا۔ اس تقریب میں سب سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شاہِ انگلستان کا پیغام پڑھ کر سنایا اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس تمام کارروائی کے دوران کرسی صدارت پر دستور ساز اسمبلی کے صدر قائداعظم محمد علی جناح تشریف فرما تھے جب کہ ان کے برابر آخری وائسرائے بیٹھے ہوئے تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے وائسرائے اور شاہِ انگلستان کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ ہمارا ہمسایوں سے بہتر اور دوستانہ تعلقات کا جذبہ کبھی کم نہ ہوگا اور ہم ساری دنیا کے دوست رہیں گے۔

15 اگست 1947ء کی صبح ہماری آزادی کا پہلا دن تھا۔

اسی دن صبح ریڈیو پاکستان لاہور نے اپنی نشریات کا آغاز آٹھ بجے سورۃ آل عمران کی آیات کی تلاوت سے کیا۔ اس کے بعد انگریزی خبریں نشر ہوئیں۔ ان خبروں کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کا ایک پیغام نشر ہوا جس میں انہوں نے پاکستان کے تمام شہریوں کو قیام پاکستان کی مبارک باد پیش کی اور کہا کہ اب ہم پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور ہمیں دُنیا کو یہ ثابت کر کے دکھانا ہے کہ ہم ایک قوم کی طرح مل جل کر امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

اسی دن صبح قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ ان سے یہ حلف لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میاں عبدالرشید نے لیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے لیاقت علی خان سے وزیراعظم کے عہدے کا حلف لیا۔ آج ہی کے دن پاکستان کی پہلی کابینہ نے بھی حلف اُٹھایا۔ چھ ارکان پر مشتمل کابینہ میں سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خان، فضل الرحمن، اسمٰعیل ابراہیم چندریگر (آئی آئی چندریگر)، ملک غلام محمد اور جوگندر ناتھ منڈل شامل تھے۔

آج ہی کے دن تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ نے بھی اپنے اپنے عہدوں کا حلف اُٹھایا۔ ان میں مشرقی بنگال کے سر فریڈرک بورن، مغربی پنجاب کے سر فرانسس موڈی، سندھ کے شیخ غلام حسین ہدایت اللہ، سرحد کے سر جارج کننگھم اور بلوچستان کے چیف کمشنر جیوفرے پرائر شامل تھے۔

15 اگست 1947ء کے دن ہی پاکستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف کے عہدے کا حلف جنرل فرینک میسروی نے، پاکستان فضائیہ کے کمانڈر انچیف کے لیے ایئر وائس مارشل پیری کین اور پاکستان بحریہ کے کمانڈر انچیف کے لیے ایڈمرل جیمز ولفریڈ نے حلف اُٹھایا۔

آج ہی کے دن سے ''روزنامہ ڈان'' کراچی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی لوح کے اوپر درج ہے۔ "Founded by Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah." اس کا اجراء اکتوبر 1942ء میں دہلی سے ہفت روزہ کی حیثیت میں ہوا تھا اور یہ لیاقت علی خان کی براہِ راست نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ لیاقت علی خان اس وقت مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے۔

ہم آنکھیں کیوں جھپکتے ہیں

ہماری آنکھوں کے جھپکنے کا مقصد اصل میں مستقل طور پر صفائی ہے۔ یہ ہو یا پھر پلکوں کے بالوں کے ذریعے ہوتی ہے لیکن صفائی اصل میں آنسو کرتے ہیں۔ آنسوؤں کا اصل مقصد بھی ہے۔ یہ پانی جسے ہم آنسو کہتے ہیں، ایک چھوٹی سی تھیلی میں بند رہتا ہے جو چھوٹی چھوٹی نسوں کے ذریعہ آنکھ میں آتا ہے اور، جب جھپکتے وقت ہماری پلکیں اوپر نیچے حرکت کرتی ہیں تو یہ پانی ساری آنکھ میں بکھر جاتا ہے اور گرد و غبار وغیرہ کو صاف کر دیتا ہے۔ بعض جانوروں مثلاً سانپوں وغیرہ کی پلکیں نہیں ہوتیں۔ اس لیے وہ کبھی آنکھیں نہیں جھپکتے۔ اس لیے گرد و غبار وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لیے پلکوں کی بجائے ان کی پتلی پر ایک بہت ہی باریک سا پردہ ہوتا ہے۔

ڈان نے مسلمانوں اور مسلم لیگ کے ترجمان کی حیثیت سے کام کر کے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں قومیت کا احساس بیدار کیا۔ اس نے مسلم صحافیوں اور مسلم اخبارات کو ہمت و استقامت کے ساتھ بھرپور طاقت بنایا۔ ڈان اخبار کی یہ خدمات ہماری ملی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ 15 اگست 1947ء سے آج تک یہ اخبار مسلسل اشاعت قائم رکھے ہوئے ہے۔

15 اگست 1947ء کے دن ہی پاکستان کا پہلا گزٹ (Gazette) شائع ہوا۔ گزٹ دراصل سرکاری احکامات کی ایک تحریری دستاویز ہوتی ہے۔ پاکستان کا پہلا گزٹ پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل چوہدری محمد علی نے جاری کیا۔ کراچی سے شائع ہونے والے اس گزٹ میں یہ اطلاع شامل تھی کہ ہر مجسٹی (شاہِ برطانیہ) نے قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل نامزد کیا ہے اور انہوں نے اپنے عہدے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اس گزٹ کے مطابق یہ اطلاع مختلف چھاؤنیوں اور افواج کے سربراہان کے علاوہ حکومتِ پاکستان کی وزارتوں کے ساتھ ساتھ تمام صوبائی حکومتوں کو دی جائے۔

اس روز پاکستان اور بھارت کے مابین مشترکہ دفاع کونسل کا قیام عمل میں آیا اور اس کے اگلے دن 16 اگست کو پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے نئی دہلی روانہ ہو گئے۔

یہ تھا پاکستان کی آزادی کے پہلے مصروف دن کا حال۔

ونیلا آئس کریم

سامان اور وزن:

کریم:	250 ملی لیٹر	ونیلا ایسنس:	ایک یا دو چائے کے چمچ	دودھ:	500 ملی لیٹر
انڈے:	8 عدد (زردی)	چینی:	200 گرام باریک		

ترکیب:

ایک بھاری پتیلی میں دودھ اور کریم کو گرم کریں۔ انڈے کی زردی اور چینی کو اچھی طرح پھینٹ کر یک جان کر لیں اور ونیلا ایسنس شامل کریں۔ اس آمیزے کو آہستہ آہستہ گرم کریم میں شامل کریں۔ چمچ سے ہلا لیں۔ ابال آنے سے پہلے چولہے سے ہٹا دیں تاکہ کریم پھٹ نہ جائے۔ باریک چھلنی سے چھان کر ٹھنڈا ہونے دیں۔ کسٹرڈ کو فریزر میں جمنے کے لیے رکھ دیں۔ جب قدرے جم جائے تو نکال کر پھینٹیں کہ یک جان ہو جائے اور دوبارہ کسٹرڈ کی شکل میں آ جائے۔ اس جمنے اور پھینٹنے کے عمل کو دو بار اور دہرائیں۔ اس کے بعد رات بھر کے لئے فریزر میں رکھ دیں تاکہ آئس کریم اچھی طرح جم جائے۔ پیش کرنے سے کچھ دیر پہلے آئس کریم فریزر سے نکال کر باہر رکھ دیں۔

رس ملائی

سامان اور وزن:

پاؤڈر کا دودھ: 2 پیالی (150 گرام)
دودھ: 4 پیالی (800 ملی لیٹر)
انڈے: 5 عدد (زردی ہلکی پھینٹی ہوئی)
(صرف زردی کے بجائے 2۔3 انڈے بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔)
بیکنگ پاؤڈر: آدھا چائے کا چمچ
گلاب کا پانی: ایک چائے کا چمچ
پکانے کا تیل: ایک کھانے کا چمچ
چینی: 4 کھانے کے چمچ
الائچی کے دانے: 4 عدد
زعفران: آدھا چائے کا چمچ

ترکیب:

پاؤڈر کا دودھ، انڈے کی زردی، بیکنگ پاؤڈر اور تیل ملا کر آمیزہ بنا لیں۔ اخروٹ کے سائز کے پیڑے بنائیں اور دبا کر چپٹی بیضوی شکل دے دیں۔ دودھ میں زعفران، گلاب کا پانی، الائچی اور چینی ملا کر گرم کریں۔ جب چینی گھل جائے تو اُبلتے ہوئے دودھ کو چھان لیں اور دوبارہ پتیلی میں ڈال دیں۔ تیار کیے ہوئے پیڑوں کو چمچ سے دودھ میں ڈالیں اور تقریباً 5 منٹ تک اُبالیں۔ چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔

کسی سوداگر نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ موتیوں والے خوب صورت سے پنجرے میں چاندی کی کٹوریاں رکھی تھیں، جن میں میاں مٹھو کے لیے دانہ پانی، پھل اور دُنیا کی ہر نعمت موجود ہوتی تھی۔ سوداگر کی بیوی نے میاں مٹھو کو انسانوں کی طرح بولنا سکھا دیا تھا۔

ایک دن سوداگر کو کسی دوسرے شہر جانے کا اتفاق ہوا تو اسے یاد آیا کہ برسوں پہلے وہ اسی شہر سے میاں مٹھو کو لے کر آیا تھا۔ سوداگر نے جانے سے پہلے میاں مٹھو سے پوچھا: "بھئی مٹھو میاں! ہم تمہارے شہر جا رہے ہیں، بتاؤ تمہارے لئے کیا لائیں؟"

"آقا! اللہ کی مہربانی سے اور آپ کی محبت کے طفیل میرے پاس ہر نعمت موجود ہے۔ ہاں اگر آپ کے پاس وقت ہو تو وہاں ہزاری باغ میں حوض کے کنارے جو بڑا سا بڑ کا درخت ہے، وہاں سب دوستوں کو میرا سلام کہیے گا اور حال احوال بتا دیجئے گا۔"

سوداگر کام سے فارغ ہو کر ہزاری باغ پہنچا اور بڑ کے درخت کے نیچے کھڑا ہو کر کہنے لگا: "اس درخت پر اگر کچھ طوطے موجود ہوں تو ان کے لئے پیغام ہے کہ میرے طوطے نے ان سب کو سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنے پنجرے میں خوب مزے سے ہے۔"

سوداگر کا اتنا کہنا تھا کہ کئی طوطے درخت پر سے پھڑ پھڑا کر گرے اور مر گئے۔ سوداگر کو یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اس نے جب واپس آ کر اپنے میاں مٹھو کو یہ حال سنایا تو وہ بھی تڑپ کر اپنے اڈے سے نیچے گرا اور مر گیا۔ سوداگر نے اسے پنجرے سے نکالا، دیکھا بھالا مگر وہ تو اکڑا پڑا تھا۔ سوداگر نے غمگین ہو کر اسے پلنگ پر رکھ دیا۔ اس کی بیوی میاں مٹھو کے مردہ جسم کو سامنے رکھے رو رہی تھی کہ وہ ایک دم پھڑ پھڑا کر سیدھا ہوا اور اُڑ کر دیوار پر جا بیٹھا۔ سوداگر اور اس کی بیوی نے لاکھ جتن کیے، مگر طوطا قابو نہ آیا بلکہ بڑی تلخ آواز میں بولا: "مجھے میرے دوستوں نے جو پیغام بھیجا ہے، اس پر عمل کر کے شکر ہے مجھے آزادی ملی۔ تم لوگوں نے مجھ پر ظلم کیا کہ مجھے اتنے دنوں قید میں رکھا۔ اب میں جاتا ہوں اور تمہیں اس ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا!"

سوداگر کی بیوی انگلی دانتوں میں دبائے حیران بیٹھی دیکھتی رہی۔ سوداگر بولا: "توبہ ہے، اس طوطے کی طرح بھی کوئی نگاہ بدلتا ہو گا؟" اسی لیے لوگ بے وفا اور بے مروت شخص کو "طوطا چشم" کہتے ہیں۔ جو شخص ایک دم بد لحاظ ہو کر اور آپ کے اچھے سلوک کو بھلا کر نگاہیں پھیر لے تو کہا جاتا ہے کہ کیسے طوطے کی طرح نگاہیں بدلی ہیں یا کیسا طوطا چشم ہے۔

☆☆☆

میرا وطن

میں ہوں سچا پاکستانی میری عظمت ہے قربانی
میری آن میرا ایمان میرا وطن ہے پاکستان
پاکستان زندہ باد
میری ہمت میری عزت دیکھو ہوگی دنیا کو حیرت
میں ہوں آندھی میں طوفان میرا وطن ہے پاکستان
پاکستان زندہ باد

(محمد حسان، راول پنڈی)

ہمارا عزم

اپنے وطن کو اپنے لہو سے سجائیں گے
ہر طور ہم تو اپنے وطن کو بچائیں گے
اس دیس پر اٹھائی اگر دشمنوں نے آنکھ
اپنے وطن پر اپنی ہی جانیں لٹائیں گے
دھرتی پہ آنچ ہم کبھی نہ آنے دیں گے
طوبیٰ وطن کی پاک سر زمین کو سجائیں گے

(طوبیٰ وحید، ہری پور)

پنکھا

گرمی نے جب تنگ کیا
ہم نے پنکھا دیا چلا
پنکھے نے دی تیز ہوا
ہر اک شے کو دیا اڑا
اُس کے ہیں بس تین ہی پر
لیکن چلتے ہیں فر فر
شاید تھک جاتا ہے
کبھی کبھی رُک جاتا ہے

(محبت خالد بھٹی، راول پنڈی)

بدگمانی کا انجام

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

''بدگمانی سے بچو، بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔''

(بخاری و مسلم)

پیارے بچو! اس حدیث میں بدگمانی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بدگمانی سے مراد بغیر دلیل اور بغیر تحقیق کسی کے بارے میں کوئی رائے یا خیال دل میں بٹھا لینا ہے۔ نبیؐ نے بدگمانی کو سب سے بڑا جھوٹ قرار دیا ہے اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ (انوار الحق، رحیم جنگ)

دنیا سے محبت اور موت سے نفرت

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت پر ایسا وقت آنے والا ہے کہ دوسری قومیں تر لقمہ سمجھ کر اس طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے دسترخوان پر ٹوٹتے ہیں۔

کسی نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہماری تعداد اس قدر کم ہو جائے گی کہ ایسا ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت تمہاری تعداد کم نہ ہوگی بلکہ تم سیلاب میں بہنے والے تنکوں کی طرح بے وزن ہو جاؤ گے اور دشمن کے دلوں سے تمہارا رعب نکل جائے گا اور تمہارے اندر بزدلی اور بے ہمتی پیدا ہو جائے گی۔

پوچھا گیا کہ ایسا کیوں ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ تب تم دنیا سے محبت اور موت سے نفرت کرنے لگو گے۔ (صائمہ رجب، ٹانڈلیانوالہ)

انمول باتیں

☆ کسی کے ساتھ اچھائی کر کے اس سے اچھائی کی توقع مت رکھو کیوں کہ جو چیزیں مانگنے سے ملیں ان کی قدر نہیں ہوتی۔

☆ جو تمہارے پاس ہے اس پر خوش رہو یہ نہ ہو کہ تم خدا سے اس کا شکوہ کرو اور وہ بھی تم سے چھن جائے۔

☆ اگر تمہیں کوئی پتھر مارے تو تم اسے تحفہ دو کیوں کہ پھل دار درخت کو لوگ پتھر ہی مارتے ہیں۔

(محمد نعیم امین، لاہور)

سنہرے موتی

☆ کسی کی طرف کیچڑ مت اچھالو کیوں کہ کیچڑ اس تک پہنچنے سے پہلے تمہارے ہاتھ ضرور گندے کرے گا۔

☆ بے وقوف لوگ ڈھول کی مانند بلند آواز ہوتے ہیں مگر اندر سے خالی۔

☆ ادب ایسا درخت ہے جس کی جڑ عقل ہے۔

☆ خوابوں کے اندر زندہ نہ رہو مگر خوابوں کو اپنے اندر زندہ رکھو۔

☆ دنیا انسان کے لیے ہے نہ کہ انسان دنیا کے لیے۔

☆ ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔

☆ جس کے دل میں برداشت کی ہمت ہوتی ہے وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔

(سمیرا شوکت، گوجرانوالہ)

حضرت علیؓ کے چند اقوال

☆ گناہ جوان کا بھی اگرچہ بد ہے مگر بوڑھے کا بدتر ہے۔

☆ لالچ تمام برائیوں کی جڑ اور علم تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

☆ انسان کے چہرے کا حسن خدا تعالیٰ کی عمدہ عنایت ہے۔

☆ یقین کے ساتھ سوتے رہنا، شک کے ساتھ نماز پڑھنے سے کہیں بہتر ہے۔

☆ سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تم کسی پر وہ عیب لگاؤ جو تم میں خود موجود ہے۔

(محمد عمیر سلیم، ساہی وال)

ماں

☆ ماں کا دل دکھانا جرم ہے۔

☆ ماں کا دوسرا نام جنت ہے۔

☆ ماں کی خوشی میں اللہ کی خوشی ہے۔

☆ ماں ایک مشعل راہ ہے جو ایک راستہ دکھاتی ہے۔

☆ ماں آنکھ کا نور ہے اور دل کا سکون ہے۔

☆ ماں کی محبت پھول سے زیادہ تازہ ہوتی ہے۔

☆ ماں کے بغیر گھر قبرستان کی مانند ہے۔

☆ ماں کا دامن عیبوں سے پاک ہے۔

☆ ماں ایک نغمہ ہے جس کا ترنم زندگی کا احساس دلاتا ہے۔

(بشریٰ نانا، شیخوپورہ)

احادیث مبارکہ کی روشنی میں نماز کا بیان

☆ نماز مومن کا نور ہے۔

☆ نماز مومنوں کی معراج ہے۔

☆ اٹھو نماز پڑھو، بے شک نماز میں شفاء ہے۔

☆ نماز جنت کی کنجی ہے۔

☆ نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز چھوڑ دی اس نے دین کا محل گرا دیا۔

☆ ایمان اور کفر کے درمیان فرق نماز چھوڑنا ہے۔

☆ اس دین میں بھلائی (نیکی) نہیں جس میں نماز نہیں۔

☆ جس شخص کے پاس نماز نہیں اس کا ایمان نہیں۔

☆ بے نمازی کی دعا قبول نہیں ہوگی۔

☆ بے نماز پر قبر تنگ کر دی جائے گی اور آخرت میں سختی سے حساب لیا جائے گا۔

☆ بے نمازی جب مرے گا تو ذلیل ہو کر مرے گا۔

☆ بے نمازی بھوک اور پیاس کی حالت میں مرے گا۔ اس کی پیاس نہ بجھے گی اگرچہ دریاؤں کا پانی اسے پلایا جائے۔

☆ صالحین کی علامت بے نمازی کے چہرے سے مٹا دی جائے گی۔

☆ جو نماز ضائع کرنے والا ہے اللہ اس کی کسی نیکی کی پروا نہ کرے گا۔

☆ بے نمازی کی عمر میں برکت نہ ہوگی۔ (محمد شہریار، شاہ کوٹ)

خوش حالی لانے والی سات چیزیں

(1) قرآن کی تلاوت (2) نماز کی پابندی (3) اللہ کا شکر ادا کرنا (4) مجبور کی مدد کرنا (5) گناہوں سے توبہ (6) عزیزوں سے اچھا سلوک (7) صبح کے وقت سورۂ یٰسین اور شام کے وقت سورۂ واقعہ کی تلاوت کرنا

(محمد عبداللہ نیازی، بھکر)

پیاری بات

دوڑ میں جیتنے والا گھوڑا نہیں جانتا کہ کامیابی کیا ہوتی ہے؟ وہ دوڑتا ہے تو صرف اپنے مالک کی طرف سے ملنے والی تکلیف کی وجہ سے۔ تو جب بھی تم خود کو تکلیف میں پاؤ، تو سمجھ جاؤ کہ تمہارا مالک چاہتا ہے کہ جیت تمہاری ہو۔

(عائشہ رزاق، وزیر آباد)

صوفی تبسم

اُردو ادب کی نام ور شخصیت غلام مصطفیٰ تبسم 14 اگست 1899ء کو امرتسر (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی اُردو، پنجابی

اور فارسی کی شاعری میں خوب شہرت کمائی اور صوفی تبسم کہلانے لگے۔ آپ نے ایف سی کالج لاہور سے ایم اے فارسی کیا اور درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں خاصے عرصہ تک صدر شعبۂ فارسی رہے۔ صوفی تبسم ماہنامہ پھول و نہال کے ایڈیٹر رہے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر پروگرامز کیے۔ براڈ کاسٹر بھی رہے۔ بچوں کے لیے ''ٹوٹ بٹوٹ'' کا کردار تخلیق کیا جو تاریخ کا حصہ بن گیا۔ آپ نے بچوں کے لیے نظمیں، غزلیں، گیت، ملی نغمے لکھے۔ ماہنامہ تعلیم و تربیت کو شائع کرنے والے ادارے فیروز سنز لاہور نے آپ کی کئی کتابیں شائع کیں جن میں انجمن، صد شعر اقبال، دوگونہ شامل ہیں۔ بچوں کے لیے جھولنے، ٹوٹ بٹوٹ، کہانیں، پہیلیاں اور سنو گپ شپ وغیرہ لکھیں۔ آپ 7 فروری 1978ء کو لاہور میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

گلِ شمشیر

گلِ شمشیر (Gladiolus) کو فلاور آف اگست یعنی اگست کا پھول کہا جاتا ہے۔ اہلِ یورپ اسے "Sword Lily" پکارتے ہیں۔ یہ سدا بہار پودا ہے جس کا تعلق آئرس (Iredeceae) خاندان سے ہے۔ گلِ شمشیر کو اس کے پتوں کی بناوٹ کے باعث یہ نام دیا گیا ہے۔ براعظم ایشیا، افریقہ اور جنوبی افریقہ میں قدرتی

طور پر بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی 260 انواع (Species) دریافت ہو چکی ہیں۔ اپنے دل فریب انداز اور بے شمار رنگوں کے باعث یہ پھول دُنیا بھر میں کاشت کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اسے Cut Flower کہا جاتا ہے کہ یہ گل دستوں کی زینت بنتا ہے۔ پاکستان میں بھی ہزاروں ایکڑ پر یہ پھول کاشت ہوتا ہے کیوں کہ اس پھول کے Sepals اور Petals ایک جیسے

ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو مجموعی طور پر "Tepals" کہا جاتا ہے۔ ہالینڈ، اٹلی، چین، جرمنی، فرانس، انگلینڈ، امریکہ، بھارت، نائیجیریا، کینیا، جنوبی افریقہ وغیرہ میں یہ اہم تجارتی فصل کے طور پر کاشت کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں اگست سے مئی تک یہ پھول بآسانی دستیاب ہوتا ہے۔ شادی بیاہ و دیگر تقریبات کے علاوہ تحائف کے طور پر بھی یہ پھول پیش کیے جاتے ہیں۔

ایکس ریز (X-rays) درحقیقت الیکٹرومیگنیٹک شعاعیں ہیں جن کی ویولینتھ (Wave Length) 0.01 سے 10 نینو میٹر تک ہوتی ہے۔ یاد رہے Nano کا مطلب ہے چھوٹا (Dwarf) اور میٹر (Matar) کا مطلب ہے پیمائش کا یونٹ۔ ایک نینو میٹر ایک میٹر کا One Billionth واں حصہ ہوتا ہے۔ یہ شعاعیں بالائے بنفشی شعاعوں (الٹراوائلیٹ شعاعوں) سے چھوٹی اور گیما (Gamma) ریز سے لمبی ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں انڈسٹری میں آلات کو دیکھنے، ایئرپورٹس پر

سیکیورٹی اور میڈیکل ریڈیوگرافی میں استعمال ہوتی ہیں۔ اندرونی اعضا اور ہڈیوں کے معائنے کے لیے ڈاکٹرز ایکس ریز سے مدد لیتے ہیں لیکن ان کی زیادتی کینسر (Cancer) کا باعث بن سکتی ہے۔ جرمن ماہر "Wilhelm Rontgen" نے 1885ء میں پہلی بار انہیں تفصیل سے بیان کیا۔ اسی لیے ایکس ریز کو بھی "Rontgen Rays" بھی کہا جاتا تھا۔ 1950ء میں ایکس ریز مائیکروسکوپ ایجاد کی گئی تاکہ نہایت چھوٹی اشیا کا مشاہدہ کیا جاسکے۔

برسات کے دنوں میں اکثر بیلی کاپٹر نما حشرات اُڑتے دکھائی دیتے ہیں جن کا نام "Dragon Fly" ہے۔ ان کا تعلق فائلم آرتھروپوڈا سے ہے جب کہ ان کی کلاس "Inselta" ہے۔ ان کا

مطالعہ "Odonalotogy" کہلاتا ہے۔ ڈریگن فلائی کی 5900 اقسام دریافت ہوچکی ہیں۔ ان کی آنکھیں بڑی، جسم لمبوترا اور پر مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔ شفاف، سرخی، نیلے گلابی اور سبز رنگ میں ان کے پر بڑے خوب صورت لگتے ہیں۔ یہ دُنیا کے تیز رفتار ترین اُڑنے والے حشرات ہیں۔ سب سے بڑے ڈریگن فلائی 10 سے 15 میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے اُڑتے ہیں۔ یہ مچھر، تتلیاں، مکھیاں، شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں وغیرہ کھا جاتے ہیں جب کہ پرندے، مینڈک، مچھلیاں، مکڑی اور چھپکلیاں انہیں کھا جاتی ہیں۔ یہ ٹھنڈی اور گیلی جگہ پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے لاروے "Nymphs" کہلاتے ہیں جو پانی میں رہتے ہیں۔ Tom Shadyac نامی فلم ڈائریکٹر نے سال 2002ء میں ڈریگن فلائی کے نام سے فلم بھی بنائی تھی۔

☆☆☆

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

آپ کا کیا حال ہے؟ تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ کہانیاں ہوارہ، پھل دار درخت، وہ میری آنکھیں کھول گیا، یہ دروازہ مت کھولنا، اجالا کہاں ہے اور سلسلہ وار ناول وولٹ پور میں بہت اچھا جارہا ہے۔ اگر تعلیم و تربیت کے 2005ء اور 2014ء کے شمارے کا موازنہ کیا جائے تو بہت ترقی نظر آتی ہے۔ اس مہینے کے آخر میں عیدالفطر ہے، پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ یوم آزادی بھی قریب ہے۔ امید ہے اگلا شمارہ اس سے بھی اچھا ہوگا۔ اللہ حافظ!

(افراح اکبر، لاہور)

☆ آپ سب کو بھی دلی عید مبارک قبول ہو۔

میں دو سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ جولائی کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ استانی کہاں گئیں؟ اجالا کہاں ہے؟ مسٹر ابو، اچھی لگیں۔ امید ہے میرا یہ خط ردی کی ٹوکری میں نہیں جائے گا۔ (محمد عون عبداللہ، واہ کینٹ)

جولائی کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ ناول بھی بہت اچھا ہے۔ میری طرف سے آپ سب کو عید مبارک۔ قدرت اللہ شہاب اور سردار عبدالرب نشتر کے بارے میں بھی کچھ لکھیں۔ (وردا عدیل، آفتاب عدیل، لاہور)

اس ماہ تیسری بار خط لکھ رہی ہوں لیکن آپ ہر مرتبہ میرا خط قابل اشاعت نہیں سمجھتے۔ جولائی کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح پر مضمون بہت اچھا تھا۔ اسکول میں ٹیبلو میں محترمہ فاطمہ جناح کا کردار ادا کرنے میں مجھے اس مضمون سے بہت مدد ملی۔ کچھ چیزیں بھیج رہی ہوں، قابل اشاعت ہوں تو رسالے میں ضرور جگہ دیجیے گا۔ آپ پاکستان کے مختلف شہروں کی سیر کروانے کا تحریری سلسلہ بھی شروع کریں۔ (رُشدہ عدنان، کراچی)

آپ کی اور ادارے سے وابستہ ہر شخص کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی امان میں رکھے اور نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جناب عالی اس بار تو ادارے نے رسالے کے قاریوں پر بہت مہربانی فرمائی کہ رسالہ 29 تاریخ کو ہی بک سٹال پر دستیاب تھا۔ بندہ آپ سب کا انتہائی مشکور ہے کہ آپ کی توجہ سے قاریوں کو رسالے کے حوالے سے انتظار کی زحمت سے بچایا۔ رسالے کو پڑھ کر دل خوش و خرم ہو گیا کہ ماشاء اللہ رسالہ اپنی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مجھے محترمہ فاطمہ جناح اور پولو پر لکھی گئی تحریریں بہت پسند آئیں۔ (محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

میں ماہ نامہ تعلیم و تربیت میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا چاہتی ہوں۔ میں نویں جماعت کی طالبہ ہوں۔ میں نے اپنے اسکول میں ہونے والے بیگ جنلسٹ کمپی ٹیشن میں حصہ لیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اپنے اسکول میں ہونے والے Parents Day کی تقریب میں ڈرامے بھی لکھے۔ میری ان تخلیقی صلاحیتوں کو بہت سراہا گیا۔ میں مصوری اور شاعری بھی کر لیتی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ مجھے ایک دفعہ موقع دیا جائے۔

(فضہ فاروق، سرائے عالم گیر)

☆ آپ اپنی تحریریں بھیجیں۔

جولائی کا شمارہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ میں نے چند کہانیاں لکھی ہیں، کیا میں بھیج سکتا ہوں؟ آپ کا یہ رسالہ بچوں کی تربیت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر نصیب فرمائے۔ آمین!

(سید محمد علی حسن، لاہور)

☆ جی ضرور بھیجیں۔

میں بہت شوق سے تعلیم و تربیت پڑھتی ہوں۔ جولائی کا شمارہ تو بہت اچھا تھا۔ مکمل تو نہ پڑھ سکی مگر عید آئی خوشیاں لائی اور الم غم زدہ بینا کی فریاد بہت پسند آئی۔ اگست کے شمارے میں "سونی دھرتی" ملی نغمہ ضرور شامل کیجیے گا، ممنون ہوں گی۔ (نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ)

میں تعلیم و تربیت اگست 2010ء سے پڑھ رہی ہوں مگر شرکت پہلی بار کر رہی ہوں۔ میں اس خط کے ساتھ ایک عدد تحریر بھی ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ دونوں چیزیں شائع کر کے حوصلہ افزائی کریں گے اور مستقبل میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوگا۔ شکریہ!

(خدیجہ اشرف، لاہور)

☆ آپ کی تحریروں کا انتظار رہے گا۔

ناول دولت پور میں ٹاپ پر تھی۔ معلومات عامہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اجالا کہاں ہے؟ پھل دار درخت، پولو اور مادر ملت فاطمہ جناح بہت پسند آئیں۔ اگست کے شمارے میں تحریک آزادی کے مجاہدوں کے بارے میں شان دار مضامین شائع کیجیے گا۔ جس طرح کا مضمون فاطمہ جناح کے بارے میں شائع کیا ہے، اسی طرح کا تحریک آزادی کے دیگر رہنماؤں نواب سلیم اللہ، محمد علی جوہر، شوکت علی جوہر، چوہدری رحمت علی پر بھی مضمون شائع کیجیے گا۔"
(محمد حارث جمیل، لاہور)

میں تین ماہ سے خط لکھ رہا ہوں لیکن وہ چھپتا نہیں۔ اس ماہ ضرور شائع کیجیے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ کہانی نمبر شائع کریں۔ اب رسالے کی بات ہو جائے۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر شکار اور عید آئی خوشیاں لائی، لاجواب تھیں۔ (عابد رحمان، لاہور)

یہ میرا پہلا خط ہے۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میں اسے بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ کھیل دس منٹ کا، ضرب المثل کہانی اور ناول دولت پور میں میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ باقی سلسلے بھی اچھے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو مزید ترقی عطا کرے۔ آمین!
(عائشہ نجم، لاہور)

میں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہوں۔ مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ کا رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے اور اس دیر ہی کی وجہ سے میں نے تین ماہ تعلیم و تربیت میں حصہ نہیں لیا۔ آپ کو میری غیر موجودگی کا احساس نہیں ہوا؟
(رانا کلیم، بھکر)

☆ ڈیئر کلیم! کیوں نہیں، آپ کی غیر موجودگی کو محسوس کیا لیکن اب غائب نہیں ہونا۔

اس بار رسالہ 7 جولائی کو ملا۔ بہت افسوس ہوا کیوں کہ میں کسی بھی انعامی سلسلے میں حصہ نہ لے پائی۔ پلیز! رسالہ جلدی بھیج دیا کریں۔ میں نے پہلے بھی کئی خطوط بھیجے مگر شائع نہیں ہوئے۔ جولائی کا شمارہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں عید آئی، خوشیاں لائی، بٹوارہ، مسٹر ابو اور پھل دار درخت بہت پسند آئیں۔ ناول دولت پور میں سپرہٹ جا رہا ہے۔ سرورق ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔
(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

جولائی کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ خاص طور پر کہانیاں "اجالا کہاں ہے؟" اور "یہ دروازہ مت کھولنا" بہت اچھی لگیں۔ ناول بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح زبردست تھے۔ مجھے نسرین شاہین کے کھیلوں کے بارے میں مضامین بہت اچھے لگتے ہیں۔ "کھیل اور کھلاڑی" کے اس سلسلے کو جاری رکھیے گا۔
(کرن فاروق، گوجرانوالہ)

تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو سلام۔ ہم تعلیم و تربیت کے نئے قاری ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ مایوسی نہیں ہو گی۔ تعلیم و تربیت ایک عمدہ اور معیاری رسالہ ہے۔ اس کی جتنی تعریف کریں، کم ہے۔ تمام کہانیاں مزے دار اور قابل تعریف ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر والے بھی اس رسالے کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہماری دادی جان اس رسالے کو بہت پسند کرتی ہیں کیوں کہ وہ بھی بچپن سے اب تک پڑھتی آ رہی ہیں۔
(حرا شاہ، عمار شاہ، جوہر آباد)

جولائی کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ایک دم زبردست تھا۔ پھل دار درخت اور مسٹر ابو اچھی کہانیاں تھیں جبکہ پولو اور محترمہ فاطمہ جناح مضمون پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ تمام سلسلے بہت اچھے ہیں جن میں پیارے اللہ کے پیارے نام اور بچوں کا انسائیکلو پیڈیا لاجواب ہیں اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اسی طرح علم کی روشنی پھیلاتا رہے۔
(محمد افضل انصاری، چوبنگ سٹی)

جولائی 2014ء کا شمارہ ملا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ سلسلہ وار ناول دولت پور میں بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس رسالے میں کچھ نہ کچھ لکھ کر ضرور بھیجتا ہوں لیکن آپ وہ شائع نہیں کرتے۔ پلیز! اب شائع کر کے حوصلہ افزائی کیجیے۔
(اسامہ بن طاہر، تلکوال)

ان کے علاوہ جن بچوں کے خطوط ہمیں موصول ہوئے ان کے نام یہ ہیں:۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ محمد اجمل شاہین انصاری، چوبنگ سٹی۔ عائشہ شہباز، بورے والا۔ حفصہ طیبر، ساہی وال۔ محمد مدثر یونس، محمد مبشر یونس، سمندری۔ تحریم وقار، جھنگ صدر۔ طس کلثوم، چکوال۔ محمد حسنین معاویہ، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان۔ فیضان حیدر بھٹی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ گوہر زمان، گوجرانوالہ۔ حافظ محمد آصف لطیف، نوشہرہ۔ ملائکہ رانی، جھنگ صدر۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ خرم اقبال، سرگودھا۔ سید نقیب الفضل ہاشمی، سید ابتسام حیدر ہاشمی، سیدہ نور المنتہیٰ ہاشمی، راولپنڈی۔ محمد ضیاء اللہ، میانوالی۔ عائشہ اقبال۔ محمد شاہد جمعہ، لاہور۔ فیضان آفریدی، نایاب آفریدی، پشاور۔ اریج عزیز الرحمٰن گوجرانوالہ۔ محمد شمیم عالم، اوکاڑہ۔ سعدیہ جاوید گل، ملتان۔ ☆☆

"میں اس بار دیکھوں گا کہ وقاص مجھ سے کیسے جیت سکتا ہے؟ اس بار میں اس کو جیتنے نہیں دوں گا۔ میں اتنا خرچ کروں گا کہ بس لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔" تنزیل نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مارکیٹ میں قدم رکھتے ہوئے سوچا۔

☆☆

وقاص اور تنزیل دونوں امیر گھرانوں کے چشم و چراغ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمسائے بھی تھے۔ دونوں ایک جماعت اور ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان میں گہری دوستی بھی تھی۔ ہر سال چودہ اگست کو وہ اپنے اپنے گھروں اور گلیوں کو خوب سجاتے تھے۔ ان میں ہر ایک کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا انتظام دوسرے سے بڑھ کر ہو۔ اس کے لیے وہ ہر سال ہزاروں روپے خرچ کر دیتے تھے۔ اس میں ان کے والدین بھی شریک کار ہوا کرتے تھے۔

عجیب بات تھی کہ دونوں جب چودہ اگست کی تیاری کے لیے انتظامات شروع کرتے تو ایک دوسرے کو اپنے اپنے انتظامات سے بے خبر رکھتے تھے۔ جب انتظامات مکمل ہو جاتے تو اس کے بعد محلے والے کسی ایک کے بارے میں کہتے سنائی دیتے کہ فلاں کے انتظامات بہت خوب صورت تھے، اس نے تو بڑا خرچہ کیا تھا۔ یہی ان کی ہار جیت کا معیار تھا اور اب تک ہر بار وقاص ہی جیتتا آیا تھا۔ تنزیل ایک مرتبہ بھی نہیں جیت سکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود وقاص کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ اس سال اس نے بڑے عجیب طریقے سے انتظامات کرنا شروع کیے تھے۔ زیادہ تر ڈیکوریشن کا سامان اپنے چچا کے ذریعے دبئی سے منگوایا تھا جو انتہائی قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی نفیس اور خوب صورت بھی تھا اور تنزیل کو یقین تھا کہ وقاص اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ آج بھی وہ اپنے بھائی کے ساتھ باقی ماندہ چیزیں خریدنے مارکیٹ میں آیا ہوا تھا۔ سارا دن اس نے اشیاء کے خریدنے میں گزار دیا۔ شام کو تھکا ہارا گھر واپس آیا اور بستر پر گرتے ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

چودہ اگست صرف ایک دن کے فاصلے پر تھا۔ اگلے دن چودہ اگست تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے انتظامات رات کو مکمل کر لیے۔ ان انتظامات کی نمائش اگلے دن ہونی تھی۔ وہ رات انہوں نے

انتظامات کرتے ہوئے گزاروی۔ رات کو دیر سے سونے کے باوجود تنزیل صبح سویرے بیدار ہو گیا تھا۔

یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وقاص کی کوٹھی کی چھت بالکل خالی تھی۔ اس پر کسی قسم کی سجاوٹ تو کیا، سوائے ایک سادہ جھنڈے کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا گھر بھی کسی قسم کی سجاوٹ سے خالی تھا۔ تنزیل کے گھر والے بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کو اچانک بُرے بُرے خیالات نے گھیر لیا۔ کہیں ان کو کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔ ''تنزیل بیٹا! تم جلدی سے ناشتا کر لو اور وقاص کے گھر سے پتا کر آؤ، وہ سب خیریت سے تو ہیں؟'' اس کی امی نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، امی جان! میں ابھی جاتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے ناشتا کیا اور تنزیل کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ ان کے گھر سے دور ہی تھا کہ اس کو سامنے سے وقاص آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچنے پر وقاص اسے بڑی گرم جوشی سے گلے ملا۔ تنزیل اس کے چہرے کے اطمینان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یعنی کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا جو وقاص کے لیے رکاوٹ بنا ہو، ورنہ وہ کم از کم پریشان تو ہوتا۔ ''یار وقاص! میں تمہاری طرف آ رہا تھا۔ خیر تو ہے آج تو تم نے چودہ اگست منانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ میں سمجھا شاید کوئی مسئلہ ہو اس لیے میں تمہاری طرف آ رہا تھا۔'' تنزیل نے کہا تو وقاص مسکرانے لگا۔ ''نہیں...... ! تنزیل ایسی کوئی بات نہیں۔ اللہ کا شکر ہے، ہم سب خیریت سے ہیں اور ہاں! آج شام کو تمہاری دعوت ہے۔ میرے گھر ضرور آنا، اچھا خدا حافظ! میں چلتا ہوں، شام کو ملیں گے۔ مجھے دعوت کے لیے بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر وقاص مڑ گیا۔ ''ارے سنو تو!'' تنزیل نے اس کو پیچھے سے پکارا۔ ''جھنڈیاں وغیرہ نہ لگانے کی وجہ تو بتاتے جاؤ۔ تم نے تو کوئی سجاوٹ ہی نہیں کی۔ آخر کیوں؟'' ''یہ بات بھی میں سب کو شام کو ہی بتاؤں گا۔ ابھی مجھے سب دوستوں کو دعوت دینی ہے اور انتظامات بھی کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر وقاص مسکراتے ہوئے تنزیل کو حیران پریشان چھوڑ کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا گیا۔

شام کو مغرب کے بعد تنزیل وقاص کے گھر پہنچ گیا۔ ان کے سب دوست آئے ہوئے تھے اور سب یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ اس بار وقاص نے چودہ اگست پر کوئی انتظام کیوں نہیں کیا؟ وقاص نے ان کی بے تابی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا کہ بھئی سب تسلی سے کھانا کھا لیں پھر میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں۔ اتنے میں کھانا لگ گیا، سب نے ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔ جلد ہی وہ سب کھانے سے فارغ ہو گئے۔ دستر خوان اُٹھا لیا گیا تو وقاص سب دوستوں کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔ ''میں نے سوچا آپ کو اور زیادہ فکر مند نہ کروں۔'' وقاص نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے باقی سب بھی سنجیدہ ہو گئے کہ اللہ خیر کرے، کوئی خاص مسئلہ ہے جس کو وقاص بتاتے ہوئے سنجیدہ ہو گیا ہے۔

''گزشتہ ہفتے کی بات ہے، صبح کو میں نے جلد ہی ناشتہ کیا۔ ابو سے پیسے لیے اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا، کیوں کہ اس دن مجھے چودہ اگست کی خریداری کے لیے جانا تھا۔ ابو نے مجھے فی الفور دس ہزار روپے دیے اور کہا کہ مزید ضرورت ہو تو کال کر دینا۔ میں ایزی پیسہ کروا دوں گا، تم نکلوا لینا۔ میں نے ان سے پیسے وصول کیے اور روانہ ہونے ہی لگا تھا کہ دادا جان کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''وقاص بیٹا، بات سنو......!'' یہ سوچ کر کہ دادا جان نے کچھ منگوانا ہو گا، میں ان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ''بیٹھو......!'' کمرے میں میرے پہنچتے ہی دادا جان نے کہا اور میں حیرت سے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں صوفے پر ٹک گیا۔ ''کہاں جا رہے ہو......؟'' ''مارکیٹ دادا جان۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا کرنے......؟'' یہ ان کا دوسرا سوال تھا۔ ''چودہ اگست کے لیے کچھ خریداری کرنے......'' ''کیا خریدو گے......؟ جھنڈیاں...... جھنڈے وغیرہ یہی کچھ نا......؟'' ان کے پوچھنے پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور مجھے اپنے قریب بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! چودہ اگست وہ دن ہے جس دن پاکستان کو ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا

گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس وقت میری عمر کوئی تین سال کے قریب تھی۔ جب پاکستان بنا تمہارے ابو اور بڑے چچا اس وقت موجود تھے۔ تمہارے ابو بھی کوئی تین سال کے تھے اور تمہارے بڑے چچا کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔ تمہاری دادی نے تمہارے بڑے چچا کو اور میں نے تمہارے ابو کو اٹھایا۔ ہم نے بقدر ضرورت قیمتی چیزیں ایک کپڑے میں باندھیں، یہ سب سامان بھی میرے ہی کندھوں پر تھا اور ہم اپنے گھر پر ایک اداس نگاہ ڈال کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمارے قافلے پر کئی حملے ہوئے جس کے نتیجے میں تمہارے بڑے چچا ہم سے جدا ہو گئے۔ بلوائیوں نے ان کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔" یہ کہتے ہوئے دادا جان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ان کو پانی کا ایک گلاس دیا۔ پانی پی کر انہوں نے پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ابو کو میں نے چھپا لیا۔ سکھوں نے ہمارا سامان بھی چھین لیا۔ تمہاری دادی اور میں بڑی مشکل سے تمہارے ابو کو لے کر پاکستان پہنچے۔ بیٹا! اس پاکستان کے لیے میں نے اپنے گھر بار، مال و دولت اور ایک بیٹے کی قربانی دی۔ تمہیں کیا پتا کہ میں وہاں کتنا مال دار تھا۔ ہمارے محلے میں کوئی میرے برابر کا مال دار نہیں تھا۔ سب کچھ لٹ گیا۔ آج بھی جب مجھے اپنا بڑا بیٹا یاد آتا ہے تو زندگی دکھی سی ہو جاتی ہے۔ گویا اس آزادی کے لیے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ بیٹا! آزادی بغیر قربانی کے ممکن نہ تھی۔ صرف ہم نے ہی نہیں، اس وقت موجود تمام مسلمانوں نے بہت سی قربانیاں دیں۔ ان قربانیوں کی بدولت یہ پاکستان ہمیں ملا۔ آج بھی ہر سال چودہ اگست کا دن ہمیں ایک قربانی کی دعوت دیتا ہے۔ جان و مال کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشات کی قربانی کی دعوت، خوشیاں منانے کی نہیں مگر ہم اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ہزاروں روپے ان جھنڈوں اور جھنڈیوں پر برباد کر دیتے ہیں جو دوسرے ہی دن گندی نالیوں میں بہتے نظر آتے ہیں۔ یہ فضول خرچی بھی ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے مگر آج کا مسلمان تو جان و مال کی کیا، خواہشات کی قربانی بھی نہیں دے سکتا۔ اس دن ایک گھر کو لاکھوں روپے خرچ کر کے سجایا گیا ہوتا ہے مگر یہ پتا نہیں ہوتا کہ اسی گھر کی ساتھ والی دیوار والے گھر میں دو دن سے کھانا تک نہیں پکا۔ نہیں، بیٹا نہیں۔ میں نے اب تک بہت برداشت کیا، اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا تو میں نے تمہیں کہہ دیا، آگے تمہاری مرضی۔ جاؤ! لے آؤ جا کر جھنڈیاں اور جھنڈے...... تم کہاں قربانیاں دے سکتے ہو، جاؤ اپنے گھر کو......!" دادا جان کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔

ان کی بات کے مکمل ہوتے ہی میں چپکے سے بغیر کچھ کہے اٹھا اور ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد میری واپسی ہوئی۔ میں جب گھر میں داخل ہوا تو دادا جان اپنی بات کے رائیگاں جانے پر افسردہ بیٹھے تھے۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر حیرت سے مجھے بلایا اور پوچھا۔ "بیٹا کیا ہوا، وہ لائے نہیں تم......؟" "کیا چیز دادا جان......؟" میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔ "وہی جھنڈیاں وغیرہ......؟" "دادا جان بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ کے سمجھانے کے بعد بھی میں یہ فضول خرچی کرتا...... آپ نے آج میری آنکھیں کھول دی ہیں، دادا جان! آئندہ میں نہ تو فضول خرچی کروں گا اور نہ ہی کسی اپنے دوست کو کرنے دوں گا۔" "اچھا تو پھر گئے کہاں تھے؟ وہ پیسے کہاں ہیں جو تم اپنے ابو سے لے کر گئے تھے؟" "دادا جان! وہ سارے پیسے محلے اور قرب و جوار کے غرباء میں تقسیم کر آیا ہوں۔" میرے یہ کہتے ہی دادا جان نے مجھے سینے سے لگا لیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یوں لگ رہا تھا کہ آج ان کو ان کا کھویا ہوا بیٹا مل گیا ہے۔ یہ سن کر وہاں پر موجود وقاص کے تمام دوستوں کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ گویا وہ بھی آئندہ فضول خرچی سے بچنے کے ساتھ غریبوں کی مدد کا عہد کر چکے تھے۔ ادھر تنزیل کا سر اپنی مقابلے والی سوچ پر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا...... اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس بار وقاص ہار کر بھی جیت گیا اور ایک وہ تھا جو جیت کر بھی ہار چکا تھا۔

☆......☆......☆

طارق موٹے آدمی کے ساتھ جلدی جلدی جا رہا تھا۔ موٹے آدمی نے راستے میں طارق کو بتایا۔

"کچھ دن پہلے مجھے اور میرے ایک یار کو جعفر کے باپ نے بلا کر کہا تھا کہ ہم دونوں تجھے اٹھا کر پہاڑی پر لے جائیں اور وہاں مار کر پہاڑی سے نیچے پھینک دیں۔ اسی لیے ہم ایک رات کو تمہیں موٹر میں ڈال کر لے گئے تھے۔"

"آپ نے مجھے بچالیا تھا۔" طارق نے کہا۔

"ہاں، میں نے تجھے بچایا تھا۔ میرا یار پیسے کے لیے بے ایمان ہوگیا۔ میں نے اس سے کہا۔ یہ لڑکا میرے بیٹے کی طرح لگتا ہے۔ میں اسے نہیں ماروں گا لیکن وہ گرم ہوگیا۔ پہاڑی پر میری اور اس کی لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے بازو پر چاقو مارا..... یہاں پر......" یہ کہتے ہوئے موٹے نے اپنا دایاں بازو طارق کی طرف بڑھایا۔

"میرے سامنے تو اس نے چاقو نہیں مارا تھا۔" طارق نے کہا۔

"بادشاہ لوکو! تو تو اس وقت نیچے گر گیا تھا۔ بعد میں ہماری لڑائی ہوئی۔ پھر میں نے اس سے چاقو چھین لیا اور وہ آگے لگ کر بھاگا۔" یہ کہہ کر موٹا آدمی ہنسا پھر بولا۔ "میں نے اسی دن گھر جا کر اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لیا اور راتوں رات دوسرے مکان میں چلا گیا۔ مجھے پتا تھا میرا بے ایمان یار جعفر کے باپ کو جا کر بتائے گا اور جعفر کا باپ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"آپ تو اس دن کوٹھی پر بھی آئے تھے۔"

"ہاں! میں اس دن چھپ چھپا کر آیا تھا۔"

"وہاں آپ کس لیے آئے تھے؟"

"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ جعفر کا باپ تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس لیے تم لوگ جلدی سے یہ جگہ چھوڑ دو۔"

"ہم ایک اور مکان میں چلے گئے ہیں۔" طارق نے بتایا۔

"ہاں! مجھے معلوم ہے۔" موٹے نے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم نے مکان بدل لیا ہے۔" یہ سن کر موٹا مسکرایا اور بولا۔ "اوئے بیباں! ہماری سی ڈی کام کرتی ہے۔ مجھے ہر گُفیہ (خفیہ) بات کا پتا چل جاتا ہے۔" اس نے طارق کی طرف دیکھا اور اسے حیران پا کر ہنسنے لگا پھر بولا۔ "میرا ایک یار جعفر کے گھر میں نوکر ہے۔ وہ گُفیہ کام کرتا ہے۔ مجھے سب باتوں کا پتا چل جاتا ہے۔ تو کسی کو نہ بتانا۔ نہیں تو میرے ساتھ اس بے چارے کی بھی ڈھبری ٹیٹ ہو جائے گی۔"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" طارق نے جواب دیا۔

دیر تک طارق موٹے کے ساتھ سڑکوں پر پھرتا رہا۔ وہ پھرتے پھرتے بہت تھک گیا۔ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی۔ اس نے کئی بار

موٹے سے پوچھا۔ "کتنی دور ہے وہ جگہ؟"

"بس نزدیک ہی ہے۔" موٹا ہر دفعہ یہی جواب دیتا اور پھر باتیں کرنے لگتا۔ موٹا باتیں کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ طارق کو غصہ آنے لگا۔ اس نے دل میں کہا۔ یہ مجھے کہاں لیے جاتا ہے۔ بھوک سے میرا برا حال ہے اور یہ چلتا جا رہا ہے۔ میں تھک بھی گیا ہوں اوپر سے یہ باتیں کر کر کے میرا دماغ کھا رہا ہے۔

طارق نے کئی بار سوچا کہ اب موٹے کے ساتھ چلنے سے انکار کر دے اور یہیں سے واپس اپنے گھر چلا جائے لیکن وہ اتنی دور آ چکا تھا اور پھر یہ ایسی جگہ پہنچ چکا تھا، جہاں وہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ طارق نے سوچا میں یہاں سے اکیلا گھر نہیں جا سکتا۔ مجھے راستہ معلوم نہیں۔ واپس جانے کے لیے بھی موٹے کی مدد لینی پڑے گی۔

طارق یہ سوچتا رہا اور چلتا رہا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

"طارق میاں! اس وقت بھوک کی پروا مت کرو۔" "تم اپنی مس کی مدد کے لیے جا رہے ہو۔ وہ بے چاری تمہاری مدد کے لیے پہنچی تھیں اور مصیبت میں پھنس گئی ہیں۔ انہیں ضرور بچانا چاہیے۔ معلوم نہیں یہ لوگ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ وہ میری اُستانی ہیں۔ اُستانی ماں کے برابر ہوتی ہے۔ وہ کتنی اچھی ہیں۔ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ انہوں نے مجھے اتنی باتیں بتائی ہیں۔ مجھے تعلیم دی ہے۔ میں انہیں ضرور بچاؤں گا۔ میں ان کی ہر طرح مدد کروں گا۔"

"وہ سامنے مکان ہے۔" موٹے نے رُک کر کہا۔

"جی!" طارق چونک کر بولا۔

"اوئے! تو کہاں مست ہو گیا ہے۔" موٹے نے طارق کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ پھر ہولے سے بولا۔ "اس مکان میں تیری اُستانی بند ہے۔ اچھا تو اب ایسا کر، اپنا بستہ مجھے دے دے۔ اُدھر بڑے درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جا۔ میں دو تین آدمیوں کو بلا کر لاتا ہوں۔ تو گھبرانا نہیں۔"

"نہیں گھبراؤں گا۔" طارق نے اپنا بستہ موٹے کو دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ بالکل نہیں گھبرانا بیٹے۔" موٹا طارق کو تھپکی دے کر بولا۔ اللہ نے مجھے بے ایمانوں سے لڑنے کی ہمت دی ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔ اس وقت کوئی خطرہ نہیں۔ وہ بے ایمان لم ڈھینگ (لمبا کالا آدمی) اس وقت کوٹھی میں ہے اور یہاں جو آدمی مکان کے باہر بیٹھا ہے وہ ڈیڑھ ٹنگا ہے۔"

"ڈیڑھ ٹنگا کیا؟" طارق نے پوچھا۔ اس کے جواب میں موٹا ایک ٹانگ ٹیڑھی کر کے چلنے لگا۔ طارق کو ہنسی آ گئی۔ وہ بولا۔

"لنگڑا ہے۔" موٹا زور سے ہنسا۔ موٹے نے جلدی سے طارق کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "اوئے ہی ہی مت کر۔ جا اُدھر جا کر بیٹھ جا۔ وہاں بیٹھ کر خیال کرنا کہ مکان میں کون کون آتا ہے یا کون باہر نکلتا ہے۔ میں آدمی لے کر آؤں گا اور تیری اُستانی کو ہم نکال لیں گے۔ جا اللہ کے حوالے۔"

طارق درخت کی طرف جانے لگا اور موٹا واپس چلا گیا۔

طارق درخت کے پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ مکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مکان کے باہر لنگڑا بیٹھا ہوا تھا لیکن طارق کو اس کی لنگڑی ٹانگ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ طارق کو بھوک زیادہ ستانے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو پکڑ لیا۔ اتنے میں ایک کار تیزی سے آئی اور مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ طارق اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تا کہ کار میں سے نکلنے والے کو اچھی طرح دیکھ سکے لیکن کار میں سے کوئی آدمی باہر نہیں نکلا۔ لنگڑا آدمی اپنی جگہ سے اُٹھا اور اندر چلا گیا۔

طارق نے دیکھا کہ لنگڑے کے اندر جانے کے فوراً بعد اس کی اُستانی باہر آئی ہیں اور لنگڑا انہیں کار میں بٹھا رہا ہے۔ اپنی مس کو دیکھتے ہی طارق کے لیے چھپا رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ درخت کے پیچھے سے نکلا اور مکان کی طرف بھاگا۔ کار ایک دم مڑی اور تیزی سے سڑک کی طرف جانے لگی۔ طارق کار کے پیچھے لپکا اور چلانے لگا۔

"مس...... مس...... مس۔" لیکن کار ہوا ہو چکی تھی۔

طارق کار کے پیچھے دوڑا لیکن کار طارق کی اُستانی کو لے کر بھاگ گئی۔ طارق بہت مایوس ہو گیا۔ اس نے سوچا، یہاں تو مجھے معلوم تھا کہ اُستانی اس مکان میں بند ہے اور باہر لنگڑا آدمی پہرہ دے رہا ہے لیکن اب کچھ پتا نہیں کہ یہ لوگ مس کو کہاں لے گئے ہیں۔ طارق مکان کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا سڑک کی طرف جانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد موٹا واپس آ گیا۔ موٹے کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ اس آدمی کی عمر کافی تھی۔ وہ دبلا پتلا اور بوڑھا سا لگتا تھا۔ بوڑھے کے پاس سائیکل تھی۔ وہ دونوں سائیکل پر بیٹھ کر یہاں آئے تھے۔

موٹے کو دیکھتے ہی طارق جلدی سے اس کی طرف لپکا اور بولا۔

"وہ مس کو لے کر چلے گئے ہیں۔"

"کس کو لے کر؟" موٹے نے پوچھا۔

"میری مس کو۔" طارق نے جواب دیا۔

"کس کو؟"

"مس کو...... مس کو۔" طارق نے کہا۔ اسے غصہ آ گیا کہ موٹے

کی سمجھ میں بات ہی نہیں آ رہی۔ وہ زور سے بولا۔

"مس کو، میری اُستانی کو۔" اور موٹے نے ہنس کر کہا۔

"تو یوں کہہ ناں، اُستانی کو۔" تو کس کو، مس کو، کس کو کر رہا ہے۔" موٹا کچھ رُک کر جلدی سے بولا۔

"کب لے گئے ہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ ایک موٹر میں بٹھا کر۔"

"یہ تو بُرا ہوا۔" موٹا افسوس سے بولا۔ پھر اس نے اپنے بوڑھے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ "یہ تو بُرا ہوا...... خیر کوئی بات نہیں...... چلو بزرگو! اسے ڈھونڈتے ہیں۔"

"میں نہیں جا سکتا۔" بوڑھے آدمی نے کہا۔

"ڈرتے ہو؟" موٹے نے سوال کیا۔

"یہاں تک تو تمہارے ساتھ آ گیا ہوں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔ "اب مجھے اور کام بھی کرنے ہیں۔"

"یہ نیکی کا کام ہے بزرگو!" موٹا بولا۔

"نیکی کا زمانہ گزر گیا۔" بوڑھا بولا۔ "اب تو مار دھاڑ کا زمانہ ہے۔ ہر شخص روپے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ لوگ سڑکوں پر سب کے سامنے عورتوں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ ایک دو روپے کے لیے ایک دوسرے کا پیٹ پھاڑ دیتے ہیں۔"

"اب چلو بھی......" طارق نے موٹے سے کہا۔ طارق نے سوچا یہ آدمی یونہی باتوں میں وقت ضائع کر رہا ہے۔ پھر طارق کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ بولا۔ "میرا بستہ کہاں ہے؟ میری کتابیں!"

"تو کتابوں کی بات چھوڑ اور کتابیں پڑھانے والی کی فکر کر۔" موٹے نے کہا۔ پھر اس آدمی کا بازو پکڑ کر بولا۔ "چل بزرگا! جلدی سے چل۔ تیرے پاس سائیکل ہے، اُستانی کو ابھی ڈھونڈ لیں گے۔" میرا خیال ہے اسے جعفر کے باپ کے گھر لے گئے ہوں گے۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" بوڑھا آدمی بولا۔

"تیرے تین جوان بیٹے ہیں پھر بھی تو ڈرتا ہے۔"

"میرے بیٹے اور میں غریب ہوں۔ ہم امیر کی دیوار سے ٹکر ماریں گے تو اپنے ہی سر پھاڑ لیں گے۔ زندگی کے چار دن ہیں وہ ذرا آرام سے کاٹ لینے دے۔" یہ کہہ کر بوڑھا واپس جانے لگا لیکن موٹے نے اس کا سائیکل پکڑ لیا اور بولا۔ "اچھا تو نہیں جاتا تو اپنا سائیکل مجھے دے۔ میری تو کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ یہ بچہ ہے۔ یہ تھک جائے گا...... تجھ سے تو یہ ننھی سی جان ہی بہادر ہے۔"

"اچھا اچھا۔" بوڑھا جلدی سے بولا۔ سائیکل لے لے مگر رات کو پہنچا دینا۔

"تیرا سائیکل کھا نہیں جاؤں گا۔" موٹے نے جواب دیا۔

موٹا طارق کو اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا کر جعفر کے گھر کی طرف چلا۔ طارق کو پہلے ہی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ صبح کو گھر سے چائے کے ساتھ روٹی کھا کر آتا۔ شام کو چار بجے اسکول سے چھٹی ہوتی تو وہ گھر جا کر کھانا کھاتا تھا۔ اب اسے سخت بھوک لگی تھی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ طارق نے ایک پرانا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ اسے یہ خیال تھا کہ گھر میں ماں انتظار کرتی ہوں گی۔ اس نے کئی بار سوچا کہ موٹے سے یہ بات کہے۔ گھر جا کر کھانا کھائے اور ماں کو بتا کر پھر موٹے کے ساتھ آ جائے۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر میں نے موٹے سے گھر جانے کی اجازت مانگی تو موٹا مجھے بھی ڈرپوک سمجھے گا، اس لیے طارق کچھ نہیں بولا۔ سائیکل پر بیٹھا رہا اور سائیکل کو موٹا چلاتا رہا۔

اُدھر جعفر کے گھر کے ایک کمرے میں طارق کی اُستانی کھڑی تھی۔ ان کے سامنے لمبا کالا آدمی پستول لیے بیٹھا تھا۔ ایک صوفے پر جعفر کے ابا بیٹھے غصے سے اُستانی کو گھور رہے تھے۔ جعفر کے ابا بولے۔ "تم اب بھی سوچ لو۔ وقت ہے۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" اُستانی نے جواب دیا۔ "میں سوچ کر ہی گھر سے نکلی تھی۔"

"تم ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ تو تمہیں پورا پورا انعام دیا جائے گا۔" جعفر کے ابا نے کہا۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھے ڈرا کر یا روپے کا لالچ دے کر ایک غریب بچے کی مدد کرنے سے روک دیں گے۔"

"زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں۔" جعفر کے ابا نے غصے سے کہا۔

"بک بک تو وہ لوگ کرتے ہیں جو دولت کی خاطر غریب بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔" یہ سنتے ہی جعفر کے ابا اُٹھے اور اُستانی کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور دانت پیس کر کہا۔

"تم اپنی ضد پر اڑو گی تو یہاں سڑتی رہو گی۔ میں تمہاری لاش کتوں کو پھینک دوں گا اور کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

"میں صرف خدا سے ڈرتی ہوں اور کسی سے نہیں۔" عین اس وقت موٹا، جعفر کے مکان کی پچھلی طرف کھڑا تھا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ موٹے نے طارق سے کہا۔ "میں سائیکل پر کھڑا ہو کر تجھے اوپر اُٹھاؤں گا۔ تو دیوار پر چڑھ کر سیدھا کوٹھے پر جانا۔ پہلا روشن دان چھوڑ کر دوسرے روشن دان سے دیکھنا۔ اسی کمرے میں تیری اُستانی بند ہے۔" یہ کہہ کر موٹے نے ہولے سے سائیکل دیوار کے ساتھ

لگائی۔ اس پر خود چڑھا۔ طارق کو اُٹھایا اور آہستہ سے بولا۔ ”ڈرے گا تو نہیں؟“

”نہیں!“ طارق نے جواب دیا۔

طارق کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ موٹے نے اسے اوپر اُٹھایا اور طارق دیوار پر کود گیا۔ وہاں سے کوٹھے پر چڑھ کر دبے پاؤں روشن دان کی طرف بڑھنے لگا۔ طارق نیچے جھک کر آہستہ آہستہ روشن دان کی طرف بڑھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے آج تک ایسا کام نہیں کیا تھا۔ طارق نے سوچا چوروں کی طرح دوسرے کے مکان پر چڑھنا بُری بات ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنی مس کو کیسے تلاش کرتا۔ مجھے تو ہر صورت میں انہیں بچانا ہے۔ نیچے مکان میں آواز سنائی دی۔ طارق فوراً رُک گیا۔ اس نے سوچا شاید کوئی چھت پر آ رہا ہے۔ شاید اس نے مجھے یہاں دیکھ لیا ہے۔ اب کوئی آدمی آئے گا اور مجھے پکڑے گا۔ یہ سوچ کر طارق کا دل اور بھی زور سے دھڑکنے لگا۔

طارق چھت پر بیٹھ گیا اور آواز پر کان لگا دیے۔ آواز بند ہوگئی۔

”کوئی نہیں آ رہا۔“ طارق نے اپنے دل میں کہا اور اُٹھ کر روشن دان کی طرف بڑھنے لگا لیکن اسے اپنی ٹانگیں کانپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

”یہ کیا.....“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”تم ڈرتے ہو؟“

”نہیں، میں نہیں ڈرتا۔“ اس نے اپنے آپ کو جواب دیا۔

”اگر ڈرتے نہیں تو تمہارا دل کیوں دھڑکتا ہے، ٹانگیں کیوں کانپ رہی ہیں؟“ طارق نے خود سے سوال کیا۔

”وہ تو ویسے ہی..... میں ذرا نیا آدمی ہوں نا۔ پہلے کبھی ایسا کام نہیں کیا نا۔“ یہ سوچ کر طارق مسکرایا۔ مسکرانے سے اس کی تسلی ہوگئی۔ وہ پھر آگے بڑھا۔ طارق ہولے ہولے چلتا ہوا ایک روشن دان کی طرف آیا، پھر دوسرے کی طرف بڑھا۔

”ایک دو۔“ طارق نے روشن دانوں کو گنتے ہوئے دل میں کہا۔ ہاں دوسرا روشن دان بھی ہے۔ اس کے متعلق موٹے نے بتایا تھا اور وہ روشن دان کے پاس بیٹھ گیا لیکن اوہ اوہ روشن دان تو بند ہے۔

طارق کو بند روشن دان دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا کتنی مصیبتوں سے یہاں تک پہنچا ہوں لیکن یہ بند ہے۔ اب اندر کیسے جھانک سکوں گا۔ موٹے نے بتایا تھا کہ اسی کمرے میں میری مس کو قید کیا ہوا ہے۔ طارق نے بند روشن دان کے شیشے میں سے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی نظر کمرے کی دیواروں پر ہی اٹک کر رہ جاتی تھی۔ دیواروں سے نیچے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتنے میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ طارق کا دل ڈر سے کانپ گیا لیکن جلدی ہی اس کا خوف دور ہوگیا۔ یہ تو موٹا آ رہا تھا۔

موٹا گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ہولے ہولے آ رہا تھا۔ سڑک سے آتی ہوئی تھوڑی تھوڑی روشنی میں موٹا عجیب سا لگتا تھا۔ طارق نے سوچا موٹا تو اس طرح آ رہا ہے جیسے میرے گھر میں رات کے وقت بلا آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ موٹا بلا ہمارا دودھ بھی چٹ کر گیا تھا۔ یہ سوچ کر طارق کو ہنسی آنے لگی۔ اس نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روکی۔ موٹا طارق کے پاس آ گیا اور آتے ہی بولا۔

”دیکھا؟“ طارق نے کوئی جواب نہ دیا۔ جواب کیسے دیتا۔ اس کا منہ تو ہنسی سے بھرا ہوا تھا۔

”دیکھا اُستانی کو؟“ موٹے نے دوبارہ کہا۔ پھر خود ہی بولا۔

”روشن دان تو بند ہے۔ ٹھہر! ابھی اسے کھولتا ہوں۔“ موٹے نے روشن دان کو ہاتھ لگایا، پھر ہاتھ ہٹا لیا اور بولا۔

”یہ روشن دان کہیں شور نہ مچا دے۔“ اس وقت موٹے کی نظر طارق پر پڑی۔ وہ بولا۔ ”اوئے تیرے منہ کو کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ طارق نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

”تو پھر اسے کیوں پکڑ رکھا ہے۔ بتا کیا ہوا؟“

”مجھے، مجھے.....ہنسی.....“ یہ کہتے کہتے طارق کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے پھر اپنا منہ دبا لیا۔ ”اوئے پاگل خانے!“ موٹا غصے سے مگر آہستہ سے بولا۔ ”تو مجھے بھی مروائے گا اور خود بھی مارا جائے گا۔ چپ ہو جا۔“ طارق نے اپنی ہنسی پر قابو پا لیا۔ موٹے نے دونوں ہاتھ سے روشن دان کو پکڑ لیا اور اسے ہولے ہولے اُٹھانے لگا۔ تھوڑا سا روشن دان کھل گیا۔ اندر سے آواز آنے لگی۔

”دیکھ!“ موٹے نے طارق کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

”تو اسے پکڑ رکھ، میں اندر دیکھتا ہوں۔“ طارق روشن دان کو پکڑنے لگا تو موٹا فوراً بولا۔

”نہیں، میں اندر نہیں دیکھتا۔ میرا منہ تو بڑے ٹلے جیسا ہے۔ پھنس جائے گا۔“ یہ بات سن کر طارق کو ہنسی آئی۔ وہ بولا۔

”آپ خود ہی تو ہنسانے والی باتیں کرتے ہیں۔“

اوئے تو باتوں کو چھوڑ..... کام کر..... لے میں پکڑتا ہوں اسے۔ تو اندر دیکھ۔ تیرا منہ پتلا سا ہے۔ زیادہ منہ اندر نہ کرنا۔ بس اپنی تھوتھنی اندر ڈالنا۔ اندر دیکھ کر بتا۔ کیا ہو رہا ہے وہاں؟“

طارق نے منہ روشن دان میں ڈالا۔ موٹے نے اس کی گردن پکڑ لی تاکہ طارق کا چہرہ زیادہ اندر نہ چلا جائے۔

طارق نے دیکھا کہ کمرے میں جعفر کے ابا دروازے کے پاس کھڑے ہیں۔ پاس ہی کالا آدمی ہاتھ میں پستول لیے کھڑا ہے۔ اس طرف اُستانی ہے لیکن طارق کو اُستانی کا صرف چہرہ ہی نظر آیا۔ اس لیے اسے معلوم نہ ہو سکا کہ اُستانی بیٹھی ہیں یا کھڑی ہیں۔ اُستانی کے بال کھلے ہوئے تھے۔ بجلی کی روشنی میں ان کا چہرہ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ طارق کو یوں لگا جیسے اُستانی کو ان لوگوں نے بہت مارا ہے۔

اپنی اُستانی کی یہ حالت دیکھ کر طارق کا دل پھر دھڑکنے لگا لیکن اب ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ غصے سے۔ میری مس کی یہ کیا حالت ہو گئی ہے۔ طارق نے سوچا اور اُس کا دل چاہا کہ فوراً اسی روشن دان سے اندر کود جائے اور جاتے ہی کالے آدمی سے پستول چھین لے اور جعفر کے ابا سے اپنی اُستانی کا پورا پورا بدلہ لے۔

اسی وقت جعفر کے ابا نے دروازہ کھولا۔ دونوں دروازے کی طرف گئے۔ جعفر کے ابا نے اُستانی کو ڈانٹ کر کہا۔ "تو جب تک ہمارا کہنا نہیں مانے گی۔ یہیں قید رہے گی۔ بھوک اور پیاس سے مر جائے گی۔" یہ کہہ کر جعفر کے ابا اور کالا آدمی دونوں باہر چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں طارق اور موٹے نے موٹر کے چلنے کی آواز سنی۔ موٹے نے کہا۔

"شاید وہ لوگ کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ چل اتر۔ جلدی سے۔"

موٹا اور طارق نیچے اترے۔ موٹے نے طارق کو مکان سے کچھ دور اندھیرے میں کھڑا کر دیا۔ سائیکل بھی اسے دے دیا اور بولا۔

"میں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں..... تو یہیں ٹھہرنا..... کوئی آدمی اس طرف آئے تو سائیکل کی گھنٹی بجا دینا۔ اچھا!"

"بہت اچھا۔" طارق نے جواب دیا۔ موٹا چلنے لگا تو اسے کچھ یاد آ گیا۔ طارق کے قریب آ کر بولا۔ "اور ہی ہاں کل نہ کرنا۔ اچھا!"

"بہت اچھا۔" طارق نے پھر جواب دیا۔

"میں ابھی واپس آ جاؤں گا۔" موٹے نے کہا اور وہ آہستہ آہستہ مکان کی طرف جانے لگا۔

اس جگہ جہاں طارق کھڑا تھا، اندھیرا تھا۔ طارق موٹے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب موٹا اندھیرے میں چلا گیا اور طارق کی نظروں سے چھپ گیا تو طارق اپنے دائیں اور بائیں دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ طارق کو اب پھر بھوک لگی۔ اس دفعہ بھوک اتنی تیز تھی کہ اس سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ طارق کو سردی بھی لگ رہی تھی لیکن اسے سردی کی کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ بس بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی تھی۔

طارق کا دھیان بار بار اپنی ماں کی طرف جاتا تھا۔ اس نے سوچا، ماں میرے لیے کھانا رکھ کر بیٹھی ہو گی۔ ماں نے خود بھی کھانا نہیں کھایا ہو گا۔ وہ میرے بغیر کچھ نہیں کھاتی۔ طارق نے دل میں کہا۔ موٹا واپس آ جائے تو میں اس سے کہوں گا۔ آپ میرا بستہ دے دیں۔ میں گھر جاؤں گا۔ میری ماں میرے لیے پریشان ہوں گی۔ طارق نے سوچا اب میری ماں مجھے ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلی ہوں گی۔ وہ مجھے سڑکوں پر تلاش کرتی ہوں گی۔ طارق ان ہی خیالوں میں تھا کہ موٹا واپس آ گیا اور آتے ہی بولا۔ "چل۔" طارق وہیں کھڑا رہا۔

"چل...... چل۔ جلدی کر۔"

"میرا بستہ مجھے دے دو۔" طارق نے کہا۔

"اوئے تو بستے کو کیا کرے گا؟"

"میں گھر جاؤں گا۔"

"ہیں؟" موٹا حیران ہو کر بولا۔ "اوئے کیا ہوا تجھے!"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" طارق نے جواب دیا۔ "میری ماں میرے لیے پریشان ہوں گی۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔"

"تو نے کھایا ہے؟" موٹے نے سوال کیا پھر جلدی سے بولا۔

"آ بیٹھ سائیکل پر، تیرا بستہ تجھے دیتا ہوں۔" موٹے نے طارق کو اپنے ساتھ بٹھا لیا اور سائیکل پر چڑھ کر اسے تیز تیز چلانے لگا۔ راستے میں بولا۔ "تجھے ماں کی بڑی فکر ہے، اوئے ماں دیا پترا۔" طارق خاموش رہا۔ موٹا پھر بولا۔ "دیکھو! اب تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ بس یوں سمجھ کہ ہاتھی نکل گیا ہے، دم رہ گئی ہے۔"

"کون سا ہاتھی؟" طارق نے پوچھا۔

"جعفر کا باپ۔" موٹے نے کہا اور زور سے ہنسا۔ طارق بھی ہنس پڑا۔ موٹے نے کہا۔ "مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ جعفر کا باپ تیری اُستانی کو کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا گیا ہے۔ اب کسی طرح اس کمرے کی چابی نکالنی ہے۔ یوں سمجھ کہ سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے لیکن چابی کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اس کے بغیر ہی تیری اُستانی کو نکال لیں گے۔"

طارق نے کچھ سوچا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے ہم چل کر ہیڈ مسٹریس کو بتاتے ہیں وہ پولیس کو اطلاع......" موٹا اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بولا۔ "تیرا تو دماغ پھر گیا ہے۔ تجھے اپنی اُستانی کی جان کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

"تو کیا پولیس ہماری مدد نہیں کرے گی؟" طارق نے پوچھا۔

"کرے گی یا نہیں کرے گی مگر اس کے آنے سے پہلے جعفر کے

باپ کو پتا چل جائے گا اور پھر تیری اُستانی کی خیر نہیں۔ تو بھی ان کے قابو آ جائے گا اور میں بھی۔'' یہ سن کر طارق خاموش ہو گیا۔

موٹا آدمی طارق کو ایک تنور پر لے آیا۔ وہاں اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ یہیں پر ایک کونے میں طارق کا بستہ پڑا تھا۔ موٹے نے طارق کو اس کا بستہ دے دیا اور بولا۔ ''لے تسلی کر لے، یہ تیرا بستہ ہے۔ اب اسے رکھ دے اور کچھ کھا پی لے۔''

طارق چارپائی پر بیٹھ کر تنور کی طرف جھک گیا۔ باہر سردی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ یہاں آگ کے پاس بیٹھ کر اسے بڑا آرام ملا۔ یہاں طارق کو گرم گرم روٹی اور دال کھانے کو ملی۔ طارق کے لیے تنور کا یہ کھانا کچھ نیا نہ تھا اس کے گھر میں بھی اکثر دال ہی پکتی تھی۔ پھر طارق کو اس وقت بہت بھوک لگی تھی اور روٹیاں بالکل گرم تھیں۔ روٹیوں سے مزے دار خوشبو آ رہی تھی۔ اس خوشبو نے طارق کی بھوک اور بھی بھڑکا دی۔ طارق نے پیٹ بھر کر کھا لیا تو موٹے نے اس کے لیے چائے منگوائی۔ موٹے نے ایک پیالی طارق کو دی اور دوسری پیالی خود لے لی۔ دونوں گرم گرم چائے پینے لگے۔

طارق جب کھانا کھا رہا تھا تو اس وقت اور لوگ بھی وہاں آ بیٹھے۔ پاس ہی ایک اور چارپائی بھی پڑی تھی۔ تین آدمی اس چارپائی پر بیٹھ کر دال روٹی کھانے لگے۔ اس وقت موٹا آدمی طارق سے دور ہی رہا۔ جب وہ کھا کر چلے گئے تو موٹا پھر طارق کے پاس آ گیا۔ اب وہ چائے پی رہا تھا۔ چائے پیتے پیتے موٹے نے کہا۔

''یہ تنور والا میرا یار ہے۔ پہلے اس کا تنور جعفر کے مکان کے پاس تھا۔ جعفر کے باپ نے اپنا مکان بڑا کرنے کے لیے اس غریب کو وہاں سے نکال دیا۔'' یہ کہہ کر موٹا چپ ہو گیا۔ وہ چائے پی چکے تو طارق بولا۔ ''ماں میری تلاش میں ادھر اُدھر پھرتی ہوں گی۔''

''تو پروا نہ کر بس تھوڑا سا کام باقی ہے۔ اب تو اپنی اُستانی کے ساتھ ہی جانا۔''

''میری مس کو چھوڑ دیں گے؟'' طارق نے جلدی سے پوچھا۔

''چھوڑ کون دے گا۔ ہم خود چھڑائیں گے اس کو۔ میرا یار جعفر کے گھر میں نوکر ہے۔ وہ اور میں مل کر تیری اُستانی کو چھڑائیں گے۔ تجھے میں یہاں اس لیے لایا تھا کہ تیرا یہ منکا روٹی اور چائے سے بھر جائے گا اور کچھ زیادہ اندھیرا بھی ہو جائے گا۔ چل اب اللہ کا نام لے کر اٹھ۔''

طارق اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا بستہ اٹھا لیا۔ موٹے نے کہا۔

''بستہ یہیں رہنے دے، سائیکل بھی یہیں رکھ دیتے ہیں۔''

بہت اچھا۔ کہہ کر طارق موٹے کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دوبارہ جعفر کے مکان پر پہنچے۔ موٹے نے پھر طارق کو اندھیری جگہ پر کھڑا کر دیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں ابھی اپنے یار کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔ ساتھ ہی چابیوں کا گچھا بھی لیتے آئیں گے اور چابی لگا کر کمرے کا تالا کھولیں گے اور تیری اُستانی کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ اچھا؟''

''بہت اچھا'' طارق نے جواب دیا۔ موٹا چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اپنے یار کے ساتھ واپس آ گیا چابیوں کا گچھا بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ موٹا اندھیری جگہ پر پہنچا، جہاں وہ طارق کو کھڑا کر کے گیا تھا لیکن طارق وہاں نہیں تھا۔

''کہاں گیا؟'' موٹے نے گھبرا کر کہا۔

''طارق کہاں گیا؟'' موٹے نے پھر کہا اور وہ طارق کو اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔

''طارق! طارق!'' موٹا آوازیں دیتا ہوا اندھیرے میں پھرنے لگا۔ اتنے میں موٹے کا دوست، اس کے پاس آ کر بولا۔

''آہستہ بول، کوئی سن لے گا۔''

''وہ کہاں چلا گیا؟'' گھبرائے ہوئے موٹے نے کہا۔

''مجھے کیا پتا کہاں گیا۔'' موٹے کا دوست بولا۔ اب جلدی سے چابیاں لگا کر تالا کھول لے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ ابھی گھر میں بہت کام ہے۔''

''تجھے کام کی پڑی ہے۔'' موٹے نے غصے سے کہا۔ یہاں پر وہ لڑکا نہیں مل رہا۔

''اسے کیا کرنا ہے۔ چل چھوڑ اسے۔''

''چھوڑ اسے۔'' موٹا جلدی سے بولا۔ اوئے اسی کے لیے تو یہ ساری مصیبت کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے چھوڑ اسے۔''

''خدا کے بندے! مجھے جلدی واپس جانا ہے۔'' موٹے کا دوست بولا۔ میں وہاں نہیں ہوں گا تو کسی کو شک پڑ جائے گا اور سارا کام دھرا رہ جائے گا۔ چل جلدی سے تالا کھول لے ورنہ کوئی آ جائے گا۔''

''پر یارا! اسے تو ڈھونڈ لوں۔''

''اب وہ کہاں ملے گا۔ وہ اپنے گھر چلا گیا ہوگا۔''

''نہیں وہ گھر جانے والا نہیں ہے۔'' موٹے نے فوراً کہا۔ وہ غریب تو ہے مگر بڑا بہادر لڑکا ہے۔ میں نے اتنا بہادر، اس قدر حوصلے والا لڑکا نہیں دیکھا۔''

اِدھر وہ دونوں باتیں کر رہے تھے اور اُدھر طارق ایک کمرے میں پڑا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں رسے سے بندھے ہوئے تھے۔

جس وقت موٹا آدمی طارق کو چھوڑ کر گیا تھا اور طارق اکیلا کھڑا تھا، اس وقت ایک آدمی جعفر کے مکان سے نکل کر اس طرف جا رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے طارق یہ سمجھا کہ وہ آدمی موٹا ہے۔ اس لیے وہ جلدی سے بولا۔ "لے آئے اپنے دوست کو؟" یہ سن کر وہ آدمی رُک گیا اور طارق کے قریب آ کر پوچھا۔ "کون ہو تم؟" طارق نے اس کی آواز سنی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے دل میں کہا۔ یہ تو موٹا آدمی نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی ہے۔ وہ آدمی پھر بولا۔ "کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس آدمی نے طارق کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" طارق نے کہا اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیوں چھوڑوں تجھے۔ تو چور ہے یہاں چوری کرنے آیا ہے۔"

"میں چور نہیں ہوں۔" طارق نے کہا۔

"سب چور یہی کہتے ہیں۔ تیرے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

طارق خاموش رہا۔ اس آدمی نے طارق کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا۔

"بتا تیرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"میں اکیلا ہوں۔" طارق بولا۔

"جھوٹ بکتا ہے۔" وہ آدمی بولا اور طارق کو ایک مکہ مارا۔ اب طارق سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس آدمی کے پیٹ میں مکہ مارا۔ وہ آدمی دور جا پڑا لیکن پھر بھاگ کر آیا اور طارق کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ پھر اس نے جلدی سے اپنا رومال نکال کر طارق کے منہ میں ٹھونس دیا اور کہا۔

"اب تو شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو نہیں بلا سکے گا...... چل میرے ساتھ۔" وہ آدمی طارق کو گھسیٹتا ہوا جعفر کے مکان میں لے آیا۔ طارق کو ایک کمرے میں دھکا دے کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ طارق دروازے کے پاس ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اپنے منہ میں ٹھنسا ہوا رومال نکال دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر آواز سنائی دی۔ "کہاں ہے چور؟"

آواز طارق نے سنی تو اسے یوں لگا جیسے یہ آواز جانی پہچانی ہے۔ پھر جھٹ اسے یاد آیا یہ تو جعفر کی ہے۔ دروازہ کھلا، اندھیرے کمرے میں قدموں کی آواز آئی، پھر بجلی روشن ہو گئی۔ طارق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، پھر جلدی سے کھول دیں۔ اس کے سامنے جعفر کھڑا تھا۔ جعفر کے پیچھے وہی آدمی تھا۔ جو طارق کو پکڑ کر لایا تھا۔

جعفر نے طارق کو دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اس آدمی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، ہنس کیوں رہے ہو؟" جعفر ہنستے ہوئے بولا۔

"یہ تو طارق ہے۔ اب یہ چوریاں بھی کرنے لگا ہے۔"

"میں نے چوری نہیں کی۔" طارق نے کہا۔

"میں نے تجھے کرنے ہی نہیں دی۔" وہ آدمی بولا۔ "اب بیٹا جیل میں جا کر چکی پیسنا۔" جعفر بولا۔

"میں پہلے ہی جانتا تھا، ان کی کوٹھی سے نکالا جائے گا تو یہ دونوں ماں بیٹا بھوکے مریں گے اور چوریاں کریں گے۔"

"میں چوری کرنے نہیں آیا۔" طارق غصے سے بولا۔

"ہاں تو تو سیر کرنے آیا ہے۔" اس آدمی نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ وہ آدمی جلدی سے باہر جانے لگا اور جاتے ہوئے جعفر سے کہا۔ "چھوٹے بابو! آپ اس کا خیال رکھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

جعفر نے دیکھا کہ طارق کے پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ وہ طارق کے قریب آتے ہوئے بڑے رُعب سے بولا۔

"بتاؤ کس لیے آئے ہو؟" طارق خاموش رہا۔

"بتاؤ کس لیے آئے ہو؟" جعفر پھر رُعب سے بولا۔ اب جعفر طارق کے بالکل قریب آ گیا اور اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

طارق کو بہت غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ جعفر کو پکڑ کر فرش پر دے مارے۔ وہ اٹھنے لگا لیکن پھر فوراً زمین پر گر گیا کیوں کہ اس کے پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ جعفر پھر کڑک کر بولا۔ "بتاؤ۔"

"میں اپنی مس کو چھڑانے آیا ہوں۔" طارق نے غصے اور جوش سے کہا۔

"مس کو چھڑوانے؟" جعفر نے کہا۔ "تمہارے ساتھ اور کون ہے؟"

"بہت سے لوگ ہیں۔" طارق نے جواب دیا۔ یہ سن کر جعفر گھبرا گیا اور زور سے بولا۔ "ابا جان! لوگ مس کو چھڑانے آئے ہیں۔" جعفر شور مچاتا ہوا باہر کی طرف جانے لگا۔ جھٹ طارق فرش پر گھسٹتا ہوا آگے بڑھا اور جعفر کی ٹانگیں پکڑ کر اسے گرا دیا۔

جعفر گرتے ہی اور بھی گھبرا گیا۔ وہ زیادہ شور مچانے لگا لیکن طارق اس کے اوپر چڑھ گیا اور اس کا منہ دبا کر بولا۔

"خبردار! ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا ورنہ گلا گھونٹ دوں گا۔"

(باقی آئندہ)

دل چسپ دنیا

محمد ندیم عباسی

سیر کی شوقین مچھلیاں

رنگ برنگی مچھلیوں کو تیرتے ہوئے تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا لیکن اب آپ مچھلیوں کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔ جی ہاں! نیدرلینڈ کے ماہرین نے ایک ایسا ننھا سا ٹرک تیار کیا ہے جو بچوں کو نہیں بلکہ مچھلیوں کو ان کی مرضی کی جگہ پر سیر کروانے لے جائے گا۔ مچھلیاں جس طرف اپنا رُخ کریں گی ٹینک میں لگے ہوئے ٹائر بھی اسی رُخ پر ہو کر چلنا شروع ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے بھی اپنے گھر پر مچھلیاں پال رکھی ہیں تو لے آیئے اسمارٹ ٹینک اور دیجیے اپنی مچھلیوں کو ڈرائیونگ کا مزہ۔

چھوٹے موٹے

بڑھتے ہوئے وزن کے باعث لوگوں کا پریشان ہونا کوئی نئی بات نہیں لیکن اب تو بڑوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی اس پریشانی میں مبتلا ہونے لگے ہیں۔ امریکی ریاست کولمبیا کے موٹے ترین بچوں کا اعزاز پانے والے 10 ماہ کے یہ دونوں بچے اپنے وزن کے ساتھ بے حد پریشان ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ باقاعدہ اپنا علاج کروائیں گے۔ 20،20 کلو سے زائد وزن رکھنے والے "سانتیاگو" اور "ایزابیلا" نامی ان دونوں بچوں کے والدین نے بڑھتے وزن کے باعث ان کی جان کو لاحق خطرات کے باعث علاج کروانے کی غرض سے انہیں ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے۔

کم سن مصور

فن عمر کا محتاج نہیں ہوتا اور اس بات کی حقیقی مثال سربیا کا گیارہ سالہ بچہ ہے جو پنسل کی مدد سے جنگلی جانوروں کی بے مثال اور حقیقت سے قریب تر تصاویر بنانے کا ماہر ہے۔ اس بچے نے دو سال کی عمر میں اپنے اس شوق کا آغاز کیا اور اب اس کی مہارت دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ اس عمر میں عالمی شہرت یافتہ مصور سے کم نہیں۔ یہ بچہ اپنے سامنے کوئی تصویر یا منظر کا خاکہ رکھے بغیر اپنے ذہن سے جنگلی جانوروں کے پورٹریٹ پنسل کی مدد سے کاغذ پر بناتا ہے اور کسی غلطی کو مٹائے بغیر چند گھنٹوں میں ایک مکمل تصویر اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے جسے دیکھ کر بالکل بھی نہیں لگتا کہ یہ تصویر ایک 11 سالہ بچے نے بنائی ہے۔

بیٹے کی محبت میں

دنیا میں کئی ایسے لوگ ہیں جو اپنے بچوں کی معصومانہ خواہشات پوری کرنے کے لیے اپنی بساط سے زیادہ کر گزرتے ہیں۔ امریکی شہر سان فرانسسکو سے تعلق رکھنے والے "ول پچیلے" نامی شخص کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کیا جا سکتا ہے جس نے اپنے بیٹے کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے گھر کے عقب میں واقع گارڈن میں رولر کوسٹر تعمیر کروایا۔ 50 سالہ کا کہنا ہے کہ وہ اس رولر کوسٹر کو تعمیر کر کے بے حد خوش ہے۔

اسکیٹ بورڈ کے بعد فنگر بورڈ

بورڈ اسکیٹنگ دنیا بھر میں ایک مشہور کھیل ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑی بورڈ پر کھڑا ہو کر نہ صرف بھاگتا ہے بلکہ رکاوٹیں بھی عبور کرتا ہے اور قلابازیاں بھی کھاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک چھوٹے سائز کے حامل اسکیٹ بورڈ پر ہاتھ کی دو انگلیاں رکھ کر ٹیبل پر بنے ایک سپورٹس کمپلیکس کے ماڈل میں موجود رکاوٹوں پر چلا کر فنگر بورڈنگ کی جاتی ہے۔

اچھا لڑکا

(علینا حیدر، کراچی)

شارون دس سال کا بہت پیارا بچہ تھا۔ اس کے ابو حامد صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند ایک اچھے انسان تھے۔ پورے محلے میں ان کا ایک نام تھا، عزت تھی۔ ان کی بیگم آصفہ بھی ان ہی کی طرح تھیں۔ شارون ان کا اکلوتا بیٹا تھا جو دونوں کو بہت عزیز تھا۔ اس کے لاڈ بھی اٹھائے جاتے تھے مگر اس کی تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جاتا تھا۔ اس لیے وہ اسکول میں بھی ہر دل عزیز تھا۔ وہ بہت لائق تھا اور ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لیتا تھا، اس لیے اساتذہ اس سے خوش رہتے تھے۔ وہ اسکول میں بھی اپنے ساتھیوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پانچ وقت کی نماز بھی اپنے وقت پر ادا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اسکول سے واپس آیا اور کھانا کھا کر نماز پڑھی۔ پھر بجائے تھوڑی دیر آرام کرنے کے وہ بھاگتا ہوا چھت پر بنے کمرے میں پہنچ گیا جہاں اس نے اپنے دوست سے لی ہوئی دو پتنگیں چھپا کر رکھی تھیں۔ وہ نکال کر باہر لے آیا اور پتنگیں اُڑانے لگا۔ امی سو رہی تھیں، اس لیے وہ بے فکر تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ آج ابو گھر پر ہی ہیں۔ ابو نے جب اسے کمرے میں موجود نہ پایا تو اوپر چھت پر آئے جہاں وہ پتنگ اُڑا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑکی میں کھڑے دیکھتے رہے۔ جب امی کے جاگنے کا وقت ہوا تو اس نے فوراً ساری چیزیں سمیٹ کر وہیں چھپا دیں، پھر جیسے ہی پیچھے مڑا تو ابو کو کھڑا دیکھ کر ڈر گیا۔ "یہ کیا تھا؟" ابو نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ شارون سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر اسے کھڑے دیکھتے رہے، پھر زور سے سانس لی اور بولے۔ "ادھر آؤ!" یہ کہہ کر مڑے اور سیڑھیاں اُترنے لگے۔ شارون بھی ان کے پیچھے تھا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر ایک صوفے پہ خود بیٹھ گئے اور دوسرے پہ وہ بیٹھ گیا۔ "یہ پتنگیں کہاں سے لے کر آئے تھے تم؟" اب وہ ذرا نرمی سے بول رہے تھے۔ "ابو دوست سے لی تھیں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ ایک ہندووانہ رسم ہے اور اسلام میں کافرانہ تہوار سے منع کیا گیا ہے۔ پیارے نبیؐ نے فرمایا کہ "جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ "وہ ہم میں سے نہیں جو غیروں کے طریقے پر عمل کرے۔" ان حدیثوں میں ہمیں صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو طریقے کافروں کے ہوں، ان پر کوئی بھی مسلمان عمل نہیں کر سکتا اور جو کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ مسلمان کی لسٹ سے خارج ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ سب کام قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہیں جو کافروں نے اختیار کیے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ پتنگ بازی سے حادثات ہوتے ہیں جن سے کئی موتیں ہوتی اور گھر اجڑتے ہیں۔ کافر اور مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے دشمن ہیں اور انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔"

پتنگ بازی تو وہ اس لیے بھی مناتے ہیں کہ یہ تہوار ایک گستاخِ رسولؐ کی یاد میں ہے جس نے نبی اکرمؐ کے خلاف دشنام طرازی کی اور مسلمان قاضی نے اس کو موت کی سزا سنائی تو سکھ اب اس کی یاد میں بسنت کی تقریبات میں پتنگ بازی کرتے ہیں اور مسلمان کو تو ان کاموں سے اس لیے بھی بچنا چاہیے کہ رب کریم کا فرمان ہے: "نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔" (المائدہ:2) اللہ کا حکم مسلمان کسی صورت نہیں ٹال سکتا۔

اپنی بات ختم کر کے ابو نے اس کی طرف دیکھا تو وہ شرمندہ سا تھا۔ "کیا آئندہ آپ پتنگ اُڑائیں گے؟" ابو کے سوال پر اس نے پورے اعتماد کے ساتھ نفی میں سر ہلایا، پھر دونوں ہی مسکرا اُٹھے۔

(پیارا انعام: 195 روپے کی کتب)

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

(محمد عبداللہ، لاہور)

"دیکھو بیٹا! یہ پان تمہارے لیے نقصان دہ ہیں، دانت خراب ہو جائیں گے، نہ کھایا کرو۔" روزانہ کی طرح آج بھی چاچو گلفام نے یاسر کو نصیحت کی۔ "بس چاچو......! آئندہ نہیں کھاؤں گا آج تو دے دیں۔" یاسر نے یقین دلانے کے انداز میں کہا اور مزید نصیحت سے بچنے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگ گیا۔

چاچو گلفام نے کچھ عرصہ قبل ہی پان کی دُکان کھولی تھی۔ یاسر کے والد چونکہ اس کے دوست تھے اس لیے وہ یاسر کو پان دینے سے گریز کرتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یاسر کو کم عمری میں ہی پان کی عادت پڑ جائے لیکن چاچو گلفام پہلے منع کرتا اور پھر پان بنا کر بھی دے دیتا، اس لیے یاسر پر اس کی نصیحت کا ذرہ برابر اثر نہ ہوتا۔ گویا جس طرح وزارت صحت کی طرف سے سگریٹ کی ڈبیا پر "سگریٹ نوشی مضر صحت ہے" بھی لکھا ہوتا ہے اور دھڑا دھڑ اس کی خرید و فروخت اور اس کی تیاری بھی ہوتی ہے، اسی طرح یہاں بھی پان سے روکنے والا جب خود پان بنا کر پیش کر رہا ہے تو پھر نصیحت بھی کھوکھلی سی ہی ہوگی۔

یاسر ایک ضدی لڑکا تھا، اسے پان سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ کسی کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا اور اب تو چند لڑکوں کی دیکھا دیکھی اس نے گٹکا بھی کھانا شروع کر دیا۔ اس کی امی کو جب پتا چلا تو انہوں نے اسے ڈانٹا، سمجھایا اور اس کے ابو کو بتانے کی دھمکی دی تو یاسر نے ڈر کے مارے اپنی امی کو ان چیزوں کے چھوڑنے کا یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ پان یا گٹکا نہیں کھائے گا مگر پان کھائے بنا اسے چین نہ آتا۔ وہ مختلف حیلے بہانوں سے پیسے لیتا اور ماں سے چھپ چھپ کر پان کھاتا۔ بالآخر جب اس کے دانت خراب ہونا شروع ہوئے تو اس کی ماں نے اس کی منتیں کیں کہ وہ پان کھانا چھوڑ دے مگر کیا مجال کہ اس کے کان پر جوں بھی رینگتی۔ اسکول میں بھی اس کے اُستاد اسے سمجھاتے مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا۔

ایک دن اسکول میں چھٹی تھی۔ سب دوستوں نے سیر و تفریح کا پروگرام بنایا اور خوشی خوشی چل پڑے۔ دُکان سے پان لے کر وہ ایک بس میں سوار ہو گئے۔ یاسر جلدی سے کھڑکی کی طرف سیٹ پر جا بیٹھا۔ آج وہ بہت خوش تھے کیوں کہ وہ شہر کے ایک بڑے مشہور پارک میں جا رہے تھے۔ وہ گپ شپ لگاتے، پان تھوکتے باہر کا نظارہ کر رہے تھے۔ اس دوران یاسر نے کھڑکی سے منہ باہر نکالا، زور سے پان کا پیک تھوکا اور دوبارہ خوش گپیوں میں لگ گیا۔ چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ بس ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ ڈرائیور نے پورے زور سے بریک لگائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سب کی نظریں سامنے سڑک کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہاں انہیں ایک شخص موٹر سائیکل روک کر نیچے اُترتا نظر آیا۔ ابھی وہ اس معمے کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ اچانک بس کا دروازہ کھلا اور ایک بدمعاش ٹائپ شخص نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ پان کے پیک سے لتھڑا ہوا تھا۔ یاسر کا پھینکا ہوا تھوک موٹر سائیکل سوار اس شخص پر پڑا تھا اور اب وہ خونخوار نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی نظریں یاسر پر جا کر رُکیں۔ تھوک پھینکتے وقت وہ اسے دیکھ چکا تھا۔ اِدھر یاسر کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس نے یاسر کو گریبان سے پکڑا اور پٹائی شروع کر دی۔ "بے شرم! بدتمیز! تجھے نظر نہیں آتا...... کیا حالت بنا دی میری!" غصے سے اس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ بس میں موجود لوگ اسے قابو کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ بالآخر ڈرائیور کی منت سماجت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا مگر یاسر کی حالت قابلِ رحم تھی، وہ بدستور روئے جا رہا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کاش! میں اپنے اُستاد اور والدہ کی بات مان لیتا تو آج یہ حشر نہ ہوتا۔ آج اس کا دماغ ٹھکانے آ گیا تھا، اس لیے اس نے آئندہ پان کھانے سے پکی توبہ کر لی۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

غلطی

(سامیہ رمضان اعوان، شیخوپورہ)

ساحلہ اور ساحل کی آئے دن کی نوک جھونک نے فائزہ بیگم کی زندگی وبال جان بنا رکھی تھی۔ فائزہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ اس کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی جو اسے یہ دن دیکھنے کو مل رہے ہیں، حالاں کہ بیٹی اور بیٹے میں اس نے کبھی تفریق نہیں کی تھی۔ ایک ماں کی اولاد ہونے کے باوجود ان کی عادات میں بہت تضاد تھا جو ان کے فساد کی صورت نظر آ رہا تھا۔ ساحلہ بڑی ہونے کی وجہ سے گھر والوں کی زیادہ توجہ کا مرکز رہی۔ والدین اس کی

پڑھائی، خواہش اور ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ بہن سے تین سال چھوٹا ہونے کے باوجود ساحل وہ توجہ حاصل نہ کر پایا تھا جو ساحلہ کی شخصیت کا خاصا تھا۔ اب جب کہ والدین کی توجہ دونوں پر مرکوز رہتی، کسی کو کم توجہ ملتی تو کسی کو زیادہ، جب ساحلہ کو بڑی بہن ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا تو اس نے خوش ہونے کی بجائے بھائی کی موجودگی کو منفی سوچوں میں ڈھال لیا۔ ماں نے جب ساحلہ کو دادی کے ساتھ سلا دیا اور خود ساحل کو لے کر سوگئی تو ساحلہ کو شدید بخار نے آلیا۔ یہ بات محسوس ہونے پر فائزہ نے دونوں بچوں کو دائیں بائیں سلا لیا لیکن اس کے باوجود ان کی سوچ میں تبدیلی نہیں آئی کہ بھائی کو ڈاکٹر کو واپس کردیا جائے۔ اب جب کہ ساحلہ ساتویں اور ساحل پانچویں میں پڑھ رہا تھا، ان کے کمرے میں کھٹ پٹ کی آوازیں سن کر فائزہ ان کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ مسئلہ کیا ہے۔ ساحلہ نہ صرف پڑھائی میں اچھی تھی بلکہ پوزیشن لے کر کام یاب ہوتی تھی جب کہ ساحل ثانوی نمبرز سے پاس ہوتا تھا جس کی وجہ سے فائزہ نے ساحل کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کردی تاکہ پڑھائی میں بہتر کارکردگی دکھائے۔ ساحلہ کو یہ بات کھٹکتی رہتی تھی اور ایک جلن کا احساس ہوتا تھا۔ جب ساحلہ دوسرے اسکول جا کر بھی پوزیشن ہولڈر رہی تو سابقہ ٹیچر نے چہارم کلاس کے طالب علموں کو احساس دلاتے ہوئے کہا کہ ساحلہ دوسرے اسکول جا کر بھی پوزیشن لیتی ہے جو کہ ہمارے اسکول کے لیے اعزاز کی بات ہے لیکن آپ بچوں کی تعلیمی حالت تسلی بخش نہیں۔ ساحل کو یہ بات باور کرائی گئی تو ساحل کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی کہ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اس کی بہن کو پذیرائی ملتی ہے۔ پھر والدین نے سمجھایا کہ دیکھو بیٹا! جب ٹیچر نے آپ کی بڑی بہن کا حوالہ دے کر بتایا کہ وہ ہمیشہ اوّل پوزیشن کام یاب ہوتی ہے تو آپ کو سب کے سامنے کتنی خوشی محسوس ہوئی تھی، اس طرح جب کوئی بہن سے کہے کہ آپ کا بھائی پڑھائی میں بہت پیچھے ہے تو شرمندگی تو ہوتی ہے نا۔ بہن کے ساتھ نوک جھوک اور لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے اس کی عزت کیا کرو اور پڑھائی میں کچھ سمجھ نہ آئے تو باجی سے پوچھ لیا کرو۔ ساحل نے ساری باتیں اپنے پلے باندھ لیں۔ آج وہ اسکول سے گھر آ کر کھانا کھایا اور ہوم ورک کرنے باجی کے کمرے میں چلا گیا۔ گھر والوں نے ساحلہ کی بھی خبر لی کہ بیٹا! بھائی چھوٹا ہونے کی وجہ سے ناسمجھ ہے۔ اسے پڑھائی میں نالائق ہونے کا طعنہ نہ دیا کرو بلکہ بھائی کی مدد کرو۔ اپنے سے کم تر نہ سمجھو، نہ ہی اسے چڑایا کرو۔ یہ اچھی بات نہیں، اللہ تعالیٰ کو بھی یہ رویہ پسند نہیں۔ ساحلہ نے سچے دل سے ماما سے معافی مانگی اور بھائی کو تنگ نہ کرنے اور پڑھائی میں بھائی کی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔

ساحلہ جو چیز جنرل اسٹور سے منگواتی، ساحل چوں چرا کیے بغیر لا کر دیتا۔ اس سے پہلے تو ماما کے کہنے پر بھی کہنا نہ مانتا تھا۔ اب تو کھیل کود میں بھی اپنی دل چسپی کم کردی اور زیادہ توجہ پڑھائی پر دیتا تھا۔ فائزہ بیگم ان کے کمرے میں دودھ دینے آئی تو دونوں پڑھائی کے کسی موضوع پر بات کر رہے تھے اور اکٹھے چاکلیٹ بھی کھائی جا رہی تھی۔ فائزہ دل ہی دل میں خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آج نتیجہ کا دن تھا۔ فائزہ بیگم سوچوں میں گم کھڑی تھی کہ یک زبان کہتے ہوئے دونوں بچے اے پلس کا انعام لیے کھڑے تھے۔ آج فائزہ بیگم بہت خوش اور اپنے ضمیر سے مطمئن تھی کہ حق داروں کو ان کا حق مل گیا ہے کیوں کہ اس نے تو اتنے سالوں سے بھی کسی کی حق تلفی نہیں کی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے دونوں بچوں کو دائیں بائیں آغوش میں لے لیا۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

سیٹی بجانے والا درزی

(شاہد حلیم، کچھ موڑ)

کسی گاؤں میں ایک درزی رہتا تھا جسے گاؤں میں سلائی کا کام بہت کم ملتا تھا اور اس کا گزر بسر مشکل سے ہو رہا تھا مگر درزی ہمیشہ خوش رہتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ وہ اسے دو وقت کی روٹی دے رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی اس کی طرح صابر اور شاکر تھی۔ ان دونوں کو دولت کا لالچ نہیں تھا۔ درزی کو سلائی کرتے ہوئے سیٹی بجانے کی عادت تھی۔ وہ کام کے دوران خوشی کے گیت گاتا اور سیٹی بجاتا رہتا۔ اس کی آواز میں اتنی کشش تھی کہ لوگ اسے سننے کے لیے وہاں جمع ہو جاتے۔ گاؤں کے بچے تو گویا سیٹی کی آواز کے دیوانے تھے۔ وہ اسے سن کر خوشی سے ناچنے لگتے۔ ایک دن کوئی مال دار تاجر اس کی دکان کے آگے سے گزر رہا تھا کہ اس

کے کانوں میں سیٹی کی آواز آئی۔ تاجر کی ساری عمر کاروبار کے ذریعے دولت اکٹھی کرنے میں گزری تھی۔ اس نے کبھی اتنی خوب صورت آواز نہیں سنی تھی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوشی کا گیت کیسا ہوتا ہے، مگر سیٹی کی آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور دل خوشی سے بھر گیا۔ کسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ دکان پر بیٹھا ایک درزی روزانہ کام کرتے ہوئے سیٹی بجاتا ہے۔ تاجر نے درزی کے بارے میں دکان داروں سے مزید معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ وہ محنتی، ایمان دار لیکن نہایت غریب ہے۔ تاجر نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ درزی سے ملا اور اس کی آواز کی بہت تعریف کی۔ درزی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر تاجر وہاں سے چلا گیا۔ رات کے وقت تاجر نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی کسی طرح درزی کی دکان میں پھینک دی اور چلا گیا۔ صبح درزی کو اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی ملی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور پھر وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ اس نے دکان بند کی اور اپنے گھر جا کر بیوی کو ساری بات بتائی۔ وہ بھی خوش ہو گئی۔ اس روز درزی سارا وقت گھر میں بیٹھا اشرفیوں سے کھیلتا رہا۔ رات ہوئی تو اس نے اشرفیوں کی تھیلی الماری میں رکھی اور تالا لگا کر بستر پر لیٹ گیا، مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی حالاں کہ پہلے بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آ جاتی تھی۔ آج تو درزی کا دماغ اشرفیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی چور اس کی اشرفیوں والی تھیلی نہ چرا لے۔ چوری کے خیال نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ اشرفیوں کو کسی محفوظ جگہ پر رکھنے کے ارادے سے اٹھا اور الماری سے تھیلی نکال کر قریبی باغ میں پہنچ گیا۔ رات کا وقت تھا، وہاں مکمل سناٹا تھا۔ اس نے ایک جگہ گڑھا کھودا اور ایک چھوٹے سے صندوق میں اشرفیوں والی تھیلی رکھ کر اس پر مٹی ڈال دی۔ یہ کام کر کے وہ اپنے گھر آ گیا لیکن نیند پھر بھی نہ آئی۔ اگلے دن سورج نکلتے ہی درزی باغ میں پہنچ گیا۔ وہ پریشان تھا کہ کسی نے اسے اشرفیاں دباتے ہوئے دیکھ نہ لیا ہو اور اس کی دولت زمین سے نکال نہ لی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی، مگر درزی وہمی ہو گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے اشرفیوں کی تھیلی زمین سے نکالی اور گھر آ گیا۔ وہ پریشان تھا کہ اب اشرفیاں کہاں چھپائے۔ درزی اشرفیوں کے خیال میں ایسا اُلجھا کہ دکان بھی نہ کھولی، ادھر بچے اور بڑے اس کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چکے تھے۔ انہیں سیٹی کی آواز سنے بغیر چین نہیں مل رہا تھا، مگر درزی تو اپنی دولت کی فکر میں گھلا جا رہا تھا۔ وہ تھیلی لے کر سارا دن گھر میں بیٹھا رہا۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا اور نہ ہی سیٹی بجائی تھی۔ وہ ہمیشہ خوش رہنے والا انسان تھا مگر آج خوشی کی جگہ خوف اور فکر نے لے لی تھی۔ درزی کی بیوی بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھی۔ اسی طرح رات ہو گئی لیکن درزی کو نیند نہ آئی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اصل بات کیا ہے؟ اس نے سوچا کہ جب وہ غریب تھا، تو ہر وقت خوش رہتا تھا، نیند بھی خوب آتی تھی مگر اب اس دولت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ سیٹی بجانا اور خوشی کے گیت گانا بھول گیا ہوں۔ یہ فکر اور پریشانی تو اس کی جان لے سکتی ہے۔ اس نے ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلے دن درزی نے وہ ساری اشرفیاں غریبوں میں بانٹ دیں اور پھر دکان کھول کر پہلے کی طرح کپڑے سیتے ہوئے سیٹی بجانے لگا۔ آج پھر بڑے اور بچے اس کی آواز سن کر خوش تھے۔ درزی کو معلوم ہو گیا تھا کہ دولت سے دل کا سکون اور راتوں کی نیند نہیں خریدی جا سکتی۔ اصل دولت تو دل کا اطمینان اور سکون ہے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

تین سوال

(محمد علی جمیل، جہلم)

"لو وہ پھر آ گیا۔" بازار سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر نے کہا اور جس کی طرف وہ کہہ رہا تھا وہ شخص بازار کے چوراہے پر آ کھڑا ہو گیا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔

"ہے کوئی مسلمان جو کہ میرے سوالوں کا جواب دے۔" یہ اس نے تین دفعہ کہا مگر کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اُتر کر واپس چلا گیا۔

"آخر کب تک یہ تماشا ہوتا رہے گا۔" ایک دکان دار نے دوسرے سے کہا۔ "کیا کریں بھائی، وہ غیر مسلم ہو کر مسلمانوں کو پکار رہا ہے مگر ہم مسلمان اس کے ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔" سب تھوڑی دیر بعد اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

کوئی ایک مہینہ پہلے یہ شخص آیا تھا۔ بہت پڑھا لکھا تھا لیکن

غیر مسلم تھا۔ اس نے آتے ہی تمام لوگوں اور مسلمان عالموں کو للکارا کہ کوئی بھی اس کے تین سوالوں کے جواب دے کر دکھائے۔ تمام مسلمان علماء اور لوگ ناکام رہے تھے۔ اس کے بعد وہ روز اپنے سوال دہراتا اور جب کوئی جواب نہ دیتا تو وہ اسلام کے خلاف باتیں کہتا مگر کوئی بھی اس کو روکنے والا نہیں تھا۔

اس دن پھر اس نے اونچی جگہ چڑھ کر یہی دہرایا۔ وہ ڈینگیں مار رہا تھا کہ قریب جاتے ہوئے ایک چھوٹے بچے نعمان نے یہ سنا۔ اس سے یہ برداشت نہ ہوا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور آگے بڑھا۔

"تمہارے سوالوں کا جواب میں دوں گا۔" اس چھوٹے سے بچے نے رعب دار آواز میں کہا اور غیر مسلم سمیت بازار میں موجود تمام افراد اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"تم، تم میرے سوالوں کا جواب دو گے۔" وہ غیر مسلم ہنسنے لگا۔

"ہاں! انشاء اللہ، میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔" وہ بچہ اپنے ارادے میں اٹل تھا۔ "اچھا تو لو میرے پہلے سوال کا جواب دو۔"

"بتاؤ کہ اس وقت تمہارا اللہ کیا کر رہا ہے؟"

پورا مجمع خاموش تھا۔ ایسے میں وہ لڑکا بولا۔ "جناب بتانے والے کا درجہ پوچھنے والے سے زیادہ ہوتا ہے۔ پس آپ اپنی جگہ سے نیچے آئیں اور میں اوپر جاؤں گا، تب ہی میں اپنے سوالوں کا جواب دوں گا۔"

اس بچے کی بات سن کر وہ نیچے اتر آیا، وہ لڑکا اوپر چڑھ گیا، پھر بولا "اے لوگو! گواہ رہنا، میرا اللہ اس وقت ایک کافر کے مرتبے کو گھٹا رہا ہے اور ایک مسلمان بچے کے رتبے کو بڑھا رہا ہے۔"

"سبحان اللہ۔" پورا مجمع بچے کا جواب سن کر جھوم اٹھا۔ کافر شرمندہ تھا۔ "بتاؤ دوسرا سوال کیا ہے؟" بچے نے پوچھا۔

"یہ بتا دو کہ خدا سے پہلے کیا تھا؟" کافر نے سوال کیا۔

"پہلے تم ایسا کرو کہ دس (10) سے الٹی گنتی گننا شروع کرو۔" اس بچے نے کہا اور وہ گنتی گننا شروع ہو گیا۔ "دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین، دو، ایک" اور پھر چپ ہو گیا۔

"بولو! رک کیوں گئے اور گنتی گنو۔" "مگر ایک سے پہلے تو کچھ ہے ہی نہیں۔" کافر نے جواب دیا۔ "لوگو گواہ رہنا۔ اللہ بھی ایک ہے۔ ایک اللہ سے پہلے کیا ہو سکتا ہے۔"

اور یہ جواب سن کر کافر ہکا بکا رہ گیا، اس کو پسینے آنے لگے۔

تیسرے سوال پر اس دفعہ مجمع چھایا اور کافر نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ خدا کا منہ کس طرف ہے؟"

لڑکے نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ "ایک موم بتی لاؤ۔" فوراً ایک موم بتی لائی گئی، اس کو روشن کیا گیا۔ پھر اس بچے نے کافر سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ اس موم بتی کی روشنی کا رخ کس طرف ہے؟"

"چاروں طرف۔" کافر بولا۔

"لوگو! گواہ رہنا، اللہ بھی ایک نور (یعنی روشنی) ہے اور وہ نور بھی چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہر طرف موجود ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

تیسرے سوال کا جواب سن کر تو کافر کا منہ ہی بند ہو گیا۔ اس کو شکست فاش ہو گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ کام ایک چھوٹے سے بچے سے لیا تھا۔ یہ چھوٹا بچہ کون تھا؟ یہ چھوٹا بچہ بڑا ہو کر اپنے وقت کا سب سے بڑا امام تھا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ تھے جو ایک بہت اچھے مسلمان تھے۔ اللہ نے ان کو بچپن ہی میں کفر کے خلاف جنگ کرنے کی صلاحیت عطا کر رکھی تھی۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

ہفتہ وار ٹائم ٹیبل

ہفتے میں اتوار ہے آرام کے لیے
خوش ہو کے جائیں پیر سے پھر کام کے لیے
منگل کے بعد بدھ گیا اور آئی جمعرات
ٹھہرو کہ کر لیں بیٹھ کر مقصد کی کوئی بات
روزِ جمعہ جب آ گیا بخشش کے در کھلے
مسجد کی سمت جتنے نمازی تھے چل پڑے
آخر کو ہفتہ آ گیا خوشیاں سمیٹ کر
ہم گھر سے نکلے گھومنے مفلر لپیٹ کر
گزرے ہیں اس طرح سے سب ایام دوستو
بیٹھے ہیں ختم کر کے سارے کام دوستو

ضیاء فراشوی

کھیل دس منٹ کا

ط	گ	ش	ف	ی	ق	م	چ	پ	ژ
ے	ڈ	ن	ع	ب	ہ	ض	د	س	غ
ڈ	ت	ا	ز	ا	ج	ع	ا	ص	ت
ب	ے	ن	گ	ط	ڑ	ل	ب	ز	س
ی	ل	د	ح	ص	ٹ	ء	ج	ک	ن
ع	ی	ع	س	ء	ع	ز	ی	ز	ی
ش	ض	ہ	ن	ش	م	ا	خ	ف	م
پ	ر	ج	ی	خ	ب	ی	ب	ح	ذ
ہ	غ	و	ن	ک	ظ	ع	ا	ر	ف
س	د	ی	و	ا	ج	ف	ڑ	ق	ث

آپ نے حروف ملا کر بچوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

اعجاز، شعیب، عزیز، تسنیم، حسنین، شفیق، عارف، حبیب، جاوید، عدنان

کہا جاتا ہے کہ قدیم چینیوں اور ہندوستانیوں نے سب سے پہلے پرچم کا استعمال کیا۔ قدیم چین میں شاہی سلسلے چوہ کے قریب 1122ء میں پرچم کی موجودگی ملتی ہے۔ تحقیق کے مطابق اس پرچم پر سرخ رنگ کا پرندہ، سفید چیتا یا ایک نیلا اژدھا بنا ہوا تھا۔ اس شاہی پرچم کا اس قدر احترام تھا کہ پرچم اٹھانے والا اسے چھو نہیں سکتا تھا۔ پرچم اٹھانے کی بہت حفاظت کی جاتی تھی کیوں کہ پرچم کا گرنا شکست تصور ہوتا تھا۔

قدیم ہندوستان میں پرچم کی اہمیت و افادیت ملتی ہے۔ جنگ میں سب سے پہلے پرچم کو ہی نشانہ بنایا جاتا تھا کیوں کہ اس کا گرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ہندوستان میں پرچموں کا استعمال چینیوں کی طرح مختلف علامات کے طور پر کیا جاتا ہے۔ 1542ء کے ابتداء تک سفید پرچم کی علامت کو عارضی طور پر جنگ بندی لیا جاتا تھا۔

ابتداء میں پرچم مکمل طور پر سفید، پیلے یا کالے رنگ کے ہوتے تھے جن پر ہاتھی یا جنگلی بیل وغیرہ کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ 1250ء میں عثمانی ترکوں نے ہلال کے نشان کا دوبارہ استعمال کیا۔ جب کسی ملک کا پرچم کسی دوسرے ملک میں اس ملک کے پرچم سے اونچا لہرایا جائے تو یہ اس کی توہین کے مترادف ہے۔ پرچم کا سرنگوں ہونا دنیا بھر میں افسوس یا ماتم کی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے۔

ہر ملک کا پرچم اس کی شناخت و آزادی کی پہچان ہے۔ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بھی اس کی شناخت اور پہچان ہے۔ پاکستان کے پرچم میں سبز رنگ اسلام کی جب کہ سفید رنگ اقلیتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ سبز رنگ کے حصے میں ایک ہلال اور ایک ستارہ بنا ہوا ہے۔

پاکستان کا قومی پرچم اس لیے بھی قابلِ احترام اور لائق تحسین ہے کہ اس کے ڈیزائن کی منظوری خود قائداعظم نے دی تھی۔ تاریخی لحاظ سے اس پرچم کا رشتہ 30 دسمبر 1906ء کو ہونے والے اجلاس سے جا ملتا ہے جس میں جنوبی ایشیاء کے اہم ترین رہنماؤں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی منظوری دی تھی۔ اس اجلاس میں پیش کیا جانے والا پرچم مکمل طور پر سبز تھا اور اس میں سفید چاند اور تارا بھی موجود تھا۔ 3 جون 1947ء کو تقسیم ہندوستان کے بعد قائداعظم نے اپنے رفقائے کار سے قومی پرچم کے لیے مشورہ کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے اصرار کیا کہ وہ دیگر نوآبادیوں کی طرح پانچواں حصہ یونین جیک کے لیے مخصوص کر دیں مگر قائداعظم نے اسے طوقِ غلامی خیال کرتے ہوئے انکار کر دیا۔

قومی پرچم کا باقاعدہ انتخاب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں ہوا۔ 11 اگست 1947ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے دو پرچم قائداعظم کو پیش کیے۔ قائداعظم نے ایک پرچم کا

انتخاب کر لیا۔ اس پر اپنے خطاب میں لیاقت علی خان نے اس پرچم کو اقوام عالم کے لیے امن کی تابندہ روایت قرار دیا اور کہا کہ یہ پرچم پاکستان کی آزادی، خود مختاری اور خوش حالی کا علم بردار ہوگا۔

قائداعظم نے نئے پرچم کی ڈیزائننگ کا کام پاک بحریہ کے سپرد کر دیا۔ کئی ڈیزائن مرتب ہونے کے بعد بالآخر اس ڈیزائن کا انتخاب ہوا جو آج ہمارے قومی پرچم کا ڈیزائن ہے۔ سب سے پہلے اس پرچم کو لہرانے کا اعزاز مولانا شبیر احمد عثمانی کو حاصل ہوا جنہوں نے 14 اگست 1947ء کو قومی پرچم دارالحکومت کراچی میں لہرایا۔

قومی پرچم تیار کرنے کی کہانی بھی بڑی دل چسپ ہے۔ یہ جون 1947ء کی بات ہے جب دو بھائیوں افضال حسین اور الطاف حسین کو پہلا قومی پرچم تیار کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان بھائیوں کی قرول باغ، دہلی میں "حسین برادرز" کے نام سے درزی کی دکان تھی۔ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری اور سرگرم سیاسی رہنما ڈاکٹر عبدالغنی قریشی اپنے کپڑے انہیں سے سلواتے تھے۔ ان بھائیوں کی دکان کام کی نفاست کے لحاظ سے مشہور و معروف تھی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی بعض ممتاز شخصیات اپنے کپڑے، شیروانیاں اور سوٹ وغیرہ حسین برادرز سے تیار کرواتے تھے۔ ان میں بھارت کے سابق صدر ذاکر حسین کے بھائی محمود حسین، ڈاکٹر شفیع الرحمن قدوائی اور مولانا ظفر احمد انصاری نمایاں ہیں۔ حسین برادرز کا ممتاز مسلم لیگیوں سے تعارف کا سہرا بھی ڈاکٹر عبدالغنی قریشی کے حوالے سے ہوا جن سے ان کے تعلقات مارچ 1934ء سے تھے۔ پھر یہ دونوں بھائی ڈاکٹر عبدالغنی قریشی کے کہنے پر ہی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان بھائیوں کو قائداعظم کی رہائش گاہ اور مسلم لیگ کے دفتر پر بھی فرائض انجام دینے کے مواقع ملتے تھے۔ شاید یہی وہ قربت تھی کہ جس کی وجہ سے قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں نے پہلے پرچم کی تیاری کے لیے انہی دو بھائیوں کا انتخاب کیا۔ ان میں سے افضال حسین کو 8 مئی 1979ء کو صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی جانب سے کراچی میں پانچ ہزار روپے کا عطیہ دیا گیا جب کہ پاکستان کے لیے پہلا پرچم تیار کرنے والی اس قد آور شخصیت کے لیے صدر مملکت کی جانب سے ہی 1987ء میں تمغۂ حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ دیے جانے کی باضابطہ اطلاع دی گئی لیکن وہ اس ایوارڈ کو وصول کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ وہ ڈیڑھ سال ہڈی کے سرطان میں مبتلا رہے اور 10 جولائی 1987ء کو وفات پا گئے۔

پرچم عام طور پر یوم پاکستان (23 مارچ) یوم آزادی (14 اگست) یوم دفاع (6 ستمبر) اور یوم قائداعظم (25 دسمبر) کو لہرایا جاتا ہے۔ تاہم حکومتِ وقت جب اعلان کرے، اس وقت بھی لہرایا جاتا ہے۔ اسی طرح قومی سوگ کے موقع پر پرچم سرنگوں کیا جاتا ہے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی برسی کے موقع پر بھی پرچم سرنگوں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی قومی شخصیت انتقال کر جائے تو بھی پرچم سرنگوں کیا جا سکتا ہے۔

قومی پرچموں کا مطالعہ کرنے والی شمالی امریکہ کی ایک ایسوسی ایشن نے ایک اچھے پرچم کے پانچ اصول مرتب کیے ہیں۔ وہ پانچ اصول یہ ہیں۔ (1) پرچم سادہ ہو۔ (2) علامتیں بامعنی ہوں۔ (3) صرف دو یا تین رنگ ہوں۔ (4) کوئی عبارت یا مہر وغیرہ نہ ہو۔ (5) پورے پرچم کا مفہوم سمجھ میں آتا ہو یا ان ملکوں کے پرچم سے اس کا تعلق ہو، جن سے اس ملک کا تعلق ہے۔

ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مشہور برطانوی اخبار گارڈین کے صحافی اینڈریو نے لکھا۔ "پاکستان کا پرچم ان پانچ اصولوں پر پورا اترتا نظر آتا ہے۔ اس پرچم کا خاکہ اتنا سادہ ہے کہ ایک اسکول کا بچہ بھی باآسانی سمجھ سکتا ہے۔ پرچم کی علامت، چاند اور ستارہ پاکستان کے مذہب کو ظاہر کرتا ہے۔ رنگ صرف دو ہیں۔ پرچم میں کوئی فضول عبارت نہیں ہے اور دوسرے اسلامی ممالک مثلاً ترکی، تیونس اور الجزائر کے پرچموں کا عکس اس میں جھلکتا ہے۔ پاکستان کا پرچم دل کش ہے اور احساس و جذبات کو بھی ابھارتا ہے۔ پاکستان کا پرچم ان اصولوں کے مطابق ایک قابل تقلید مثال ہے۔"

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ پاکستان کا پرچم دنیا کا باوقار پرچم ہے۔ اس پرچم کی معنویت کا مقابلہ دوسرے ممالک کے پرچم نہیں کر سکتے۔ ستارہ و ہلال سے جگمگاتے سبز پرچم کے ساتھ ایک سفید پٹی باور کراتی ہے کہ پاکستان اقلیتوں اور غیر مسلموں کے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے۔ اقلیتوں کے تحفظ کا ایسا باوقار انداز دنیا کے کسی اور پرچم میں موجود نہیں۔ چناں چہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کا پرچم ہی عالمی معیار پر پورا اترتا ہے۔

☆☆☆

فون سنتے ہی ان کے پیروں سے جیسے زمین نکل گئی۔ پہلے تو انہوں نے بے یقینی کی کیفیت میں فون کرنے والے سے وضاحتیں چاہیں مگر فون کرنے والے نے زیادہ بات نہیں کی اور فون بند کر دیا۔ رابطہ منقطع ہوتے ہی اختر میاں فوراً حماد کے کمرے کی طرف دوڑے۔ انہوں نے جاتے ہی اپنے گھر کا فون نمبر ملانا شروع کیا۔ حماد نے انہیں کبھی اس قدر گھبراہٹ و پریشانی میں نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی فکر مند ہوتے ہوئے پوچھ لیا۔

''خیر تو ہے، کیا ہوا میاں......؟''

''خیر نہیں ہے، کسی نے فون کیا ہے اور میرا نام لے کر کہا ہے کہ تمہاری والدہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور رکشے والا انہیں سول اسپتال لے کر گیا ہے اور وہیں سے اس نے فون کیا ہے۔ اصل میں گھر سے تصدیق کرنی ہے۔'' اختر میاں نے فکرمندی سے کہا۔ نمبر ملتے ہی انہوں نے اپنے اوسان پر قابو پایا، پھر اپنی بیگم کی آواز پہچانتے ہی بولے۔ ''ہیلو...... بیگم اماں کو فون دو!''

''خیریت تو ہے...... اماں تو بازار گئی ہیں۔'' بیگم نے انہیں بتایا۔

''کتنی دیر ہوئی......؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کوئی دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟ آفس میں بیٹھے بیٹھے اماں کا خیال کیسے آ گیا۔'' بیگم نے فکریہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں! ہاں خیر ہی ہے، بس انہی سے کام تھا۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے ریسیور رکھتے ہی حماد سے کہا۔

''اماں واقعی دو گھنٹے سے گھر پر نہیں ہیں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، آپ اپنی گاڑی کی چابی دیں۔ میں سول اسپتال جا رہا ہوں۔ اگر گھر سے فون آئے تو انہیں نہیں بتانا...... اور یہ میرا موبائل رکھ لیں، کم بخت کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے۔'' اختر میاں نے ایک ہی سانس میں اتنی لمبی بات کہہ دی۔ انہوں نے موٹر سائیکل کی چابی لی، حماد کے اسٹور روم میں سے نکلے اور باہر کی جانب دوڑ گئے۔ ایمرجنسی روم میں پہنچتے ہی انہوں نے کاؤنٹر پر موجود نوجوان سے پوچھا۔

''کیا کسی خاتون کو ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں لایا گیا ہے؟''

''جی ہاں! یہیں ہیں...... ایمرجنسی وارڈ میں......'' نوجوان نے انہیں اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ اختر میاں دوڑتے ہوئے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی بیڈ پر ایک بوڑھی اماں کو پڑے دیکھا تو اس کے قریب پہنچے۔ انہوں نے اطمینان کا ٹھنڈا سانس لیا اور ان کو مخاطب کیا۔

"اماں...... اماں......" دوسری بار آواز دینے پر اماں نے انتہائی تکلیف کے ساتھ اپنی گردن گھمائی۔ اماں کے زخمی چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کی پریشانی بڑھ گئی۔ انہوں نے فوراً ہی اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور کہا۔

"آپ بے فکر رہیں، اب میں آ گیا ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ بات کہتے ہی وہ ڈاکٹر روم کی طرف بھاگے، پھر انہوں نے جاتے ہی ڈاکٹر سے کہا۔

"ایمرجنسی میں میری 'اماں' ہیں...... پلیز! آپ انہیں دیکھیں۔"

"جی ہم انہیں دیکھ چکے ہیں، ضروری علاج شروع کر دیا ہے۔ آپ بازار سے یہ دوائیں لے آئیں۔" ڈاکٹر نے ایک پرچہ انہیں دیتے ہوئے کہا۔ پرچہ لیتے ہی اختر میاں فوراً میڈیکل اسٹور کی طرف دوڑے۔ ڈرپ اور دوائیں لا کر ڈاکٹر کو دیں اور خود جا کر اماں کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر گیلا کیا اور اماں کے ہاتھ اور منہ صاف کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر نے ان کے پیر اور سر کے زخم صاف کیے اور ڈرپ بھی لگا دی۔ اماں کے سر پر شدید چوٹیں آئیں، خون بھی بہت بہہ گیا تھا۔ دوسرے ان کا زخم اتنا گہرا تھا کہ صرف پٹی باندھنے سے ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹانکے لگانے کے بعد ڈاکٹر نے انہیں وارڈ میں منتقل کر دیا کیوں کہ ڈرپ لگنے میں کم از کم دو گھنٹے تو لازمی لگتے ہیں۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ اماں کی تھوڑی ہمت بندھ گئی ہے تو انہوں نے پوچھا۔

"یہ سب کیسے ہو گیا......؟"

"پتا نہیں بیٹا! میں سبزی لے کر آ رہی تھی کہ میں...... پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔" اماں نے تکلیف سے کراہتے ہوئے بتایا۔

"ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ڈرپ چڑھ جائے گی۔ آپ بے فکر رہیں، اللہ نے بہت رحم کر دیا ہے۔" اختر میاں نے حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا۔ اختر میاں کے آفس کا ٹائم دو بجے تک کا تھا۔ اماں کی تکلیف میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ انہیں حماد کی گاڑی بھی پہنچانی ہے۔ آفس ٹائم ختم ہونے تک حماد بھائی، اختر میاں کا انتظار کرتے رہے۔ جب مزید ایک گھنٹہ ہو گیا تو انہوں نے اختر میاں کے گھر کا فون نمبر ملایا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی انہوں نے کہا۔

"ہیلو...... کون؟ بیٹی ثامیہ...... ابو کو تو فون دو......"

"انکل! ابو تو ابھی آفس سے نہیں آئے۔" ثامیہ نے انہیں بتایا۔ "کیوں خیریت تو ہے؟"

"اچھا! اپنی امی کو فون دو......" حماد بھائی کے کہتے ہی ثامیہ تیز آواز سے اپنی امی کو بلانے لگی۔ پھر فون پر آتے ہی بھابی نے پوچھا۔

"ہیلو حماد بھائی! خیریت تو ہے؟"

"بھابی وہ...... وہ اماں بی...... بھئی، اماں بی سے بات کرنی تھی۔ ثامیہ نے آپ کو بلا دیا۔" حماد بھائی نے بات کو گھماتے ہوئے کہا۔

"حماد بھائی! خیریت تو ہے؟ کوئی گیارہ بجے ان کا بھی فون آیا تھا۔ وہ بھی اماں بی سے بات کرنا چاہتے تھے اور اب آپ بھی...... خدارا بتائیں تو سہی کہ معاملہ کیا ہے؟ اماں بی ابھی تک بازار سے نہیں آئیں جب کہ وہ بھی ابھی تک آفس سے نہیں آئے ہیں۔" ثامیہ کی امی نے اب تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

"بھابی پلیز! میری بات ہمت سے سنیں۔ بازار میں...... اماں کو چکر آ گئے تھے۔ کوئی صاحب انہیں اسپتال لے کر گئے۔ اسی نے اختر میاں کو فون کر کے بتایا تھا۔ وہ صاحب وہیں گئے ہیں، ابھی آ جائیں گے۔" حماد بھائی نے انہیں بہت سمجھداری سے آگاہ کیا۔

"اوہ میرے خدا، اسی لیے میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔" فون سنتے ہی انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ روتی پیٹتی ہوئی ثاقب کا ہاتھ پکڑا اور رکشہ لے کر سول اسپتال کے لیے بھاگیں۔

وہاں وارڈ میں اماں کے ڈرپ لگ چکی تھی اور اختر میاں اماں کو سہارا دے کر اسپتال سے باہر لا رہے تھے۔ ثامیہ کی امی بھی اسپتال آ پہنچیں۔ پہلے وہ سیدھی ایمرجنسی وارڈ میں گئیں مگر اختر میاں وہاں نہیں تھے۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی انہیں تلاش کرتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھیں کہ ان کا پیر مڑ گیا اور وہ بے چاری دھڑام سے زمین پر آ گریں۔ ننھے ثاقب نے انہیں سہارا دے کر اُٹھایا۔ اچانک ہی ثاقب کی نظر دور اپنے بابا جان پر پڑی جو کہ ایک اماں کو سہارا دے کر رکشے کی طرف لے جا رہے تھے۔ ثاقب نے انہیں بہت آوازیں دیں مگر اس ننھے کی آواز اس شور زدہ ماحول میں اختر میاں تک نہ پہنچ سکی۔

ایمرجنسی کے سامنے اچانک ایک رکشہ اور آ کر رکا۔ اماں بی کو اپنے سامنے صحیح سلامت دیکھتے ہی ثامیہ کی امی اپنے پیر کی موچ بھول کر رکشے کی طرف بڑھیں۔

"اماں بی...... آپ ٹھیک تو ہیں......؟"

"ارے میں ٹھیک ہوں۔ یہ اختر میاں کہاں ہیں...... کس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، معاملہ کیا ہے؟"

"اماں بی! وہ اس طرف گئے ہیں۔ ثاقب نے انہیں کسی خاتون کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ارے وہ دیکھیں، اسی طرف آ رہے ہیں۔" اختر میاں تیزی سے اسی طرف آ رہے تھے۔ ثاقب نے دور ہی سے انہیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"بابا جان......"

بعض اوقات ہم کوئی خبر سن کر بے ہوش کیوں ہو جاتے ہیں؟

بے ہوش ہونے کے کئی اسباب ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ دماغ کے کسی خاص حصے کو خون کی ترسیل (سپلائی) رک جاتی ہے۔ ایسا کسی زبردست یا اچانک حادثے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے صدمے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ کے حساس ترین حصے میں خون کا جانا رک جاتا ہے جس کی وجہ سے آدمی یک دم زرد یا سفید ہو جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں گر پڑنے کا مقصد حقیقت میں قدرت کی چیزوں کو اپنی حالت میں لانا ہوتا ہے کیوں کہ جب آدمی پیٹ حالت میں لیٹا ہوتا ہے تو کھڑے ہونے کی بہ نسبت اس حالت میں خون کا دماغ میں پہنچنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسی وجہ سے کوئی شخص بے ہوش ہو جائے تو اسے فوراً زمین پر لٹا دینا چاہیے۔ اس کا سر قدرے نیچا ہونا چاہیے۔ وہ جلدی ہوش میں آ جائے گا۔

"ارے ثاقب...... اماں بی...... آپ بھی......" اختر میاں نے آتے ہی اپنی ماں کی پیشانی چوم لی اور خوشی سے مسرور کیفیت میں انہوں نے ثاقب کو گود میں اٹھا لیا۔

"ارے کس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور تم رکشے میں کسے چھوڑ کر آئے ہو......؟" اماں بی نے گھبرائی ہوئی کیفیت میں پوچھا۔

"اماں! آفس میں ایک فون آیا تھا۔ اس نے میرا نام لے کر آپ کے ایکسیڈنٹ کا بتایا تھا۔ میں نے جب گھر پر تصدیق کی تو آپ واقعی وہاں نہیں تھیں تو میں فوراً یہاں پہنچا۔ آپ ہی کی عمر کی ایک خاتون کو شدید زخمی حالت میں دیکھا۔ کوئی ہمدرد رکشے والا انہیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اسی نے نمبر غلط ملایا تھا کہ مجھ سے مل گیا۔ اتفاق سے ان کے بیٹے کا نام بھی اختر تھا۔ اماں وہ خاتون اسی آسرے پر یہاں بے یار و مددگار پڑی تھیں کہ ان کے گھر سے کوئی آنے والا ہے۔ میں انہیں صرف اس لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ وہ میری ماں نہیں ہے۔ میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا کہ سب مائیں تو ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہ غیر خاتون بھی میری ماں کی طرح ہیں۔ انہیں اپنی ماں سمجھ کر ان کا علاج کروایا۔ میں انہیں رکشے میں بٹھا کر ابھی فارغ ہوا ہوں۔"

"واہ میرے بچے! تم نے کسی کی ماں کو بچا کر میرا دل ٹھنڈا کر دیا ہے۔ دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھنا ہی انسانیت ہے۔"

یہ کہتے ہی اماں نے اختر میاں کا ماتھا چوم لیا تو انہوں نے بھی اپنا سر ماں کے کندھے پر رکھ دیا۔

☆ ☆

کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل "پولو" گلگت بلتستان کا سب سے مقبول کھیل ہے اور یہاں کی ثقافت کا اہم جزو ہے۔ محققین کے مطابق پولو نے وسطی ایشیاء میں جنم لیا، ایران میں پرورش پائی اور گلگت بلتستان اور چترال میں جوان ہوا۔

گلگت بلتستان میں پولو کا کھیل فری اسٹائل خصوصیات کے باعث علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بہت مشہور ہے۔ اس کھیل کے دوران کوئی ریفری نہیں ہوتا، جیسے کہ دوسرے کھیلوں میں ہوتا ہے۔ اس 'فری اسٹائل' انفرادیت کی وجہ سے یہ کھیل بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ پولو کے کھلاڑیوں کا کھیلنے کا انداز نہایت جارحانہ، جوشیلا، پُرخطر اور ولولہ انگیز ہوتا ہے۔ کھلاڑی گیند اور گول کے حصول کے لیے جان کی بازی لگاتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ یہ کھیل گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلا جاتا ہے اس لیے میچ کے دوران گیند کیچ کر کے مخالف کھلاڑیوں سے اپنے آپ کو بچا کر گول کی جانب گھوڑا دوڑانے، گیند کے حصول کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دینے، پولو اسٹک دوسرے کھلاڑی کے پولو اسٹک پر مار کے شارٹ خطا کرانے، گھوڑے کو دوڑانے کے لیے اسے زور زور سے چابک مارنے، گول کرنے کے بعد کھلاڑیوں کا گیند ہاتھ میں لے کر گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے گراؤنڈ کے درمیان آ کر ہٹ لگانے، دیسی میوزک بینڈ کے روایتی میوزک کی تھاپ پر کھیل کو مزید تیز کرنے اور شائقین کی تالیوں، نعروں اور کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی سے ماحول کو گرمانے جیسے مناظر اس کھیل میں چار چاند لگا دیتے ہیں اور کھیل کی رونق کو دوبالا کرتے ہیں۔ اس منفرد اور دل چسپ انداز نے جہاں پولو کے کھیل کو ایک بلند مقام عطا کیا ہے، وہیں شائقین کو تفریح کا ایک زبردست سامان بھی فراہم کیا ہے۔

اس کھیل کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کا مہنگا ترین کھیل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت مہنگے گھوڑے استعمال ہوتے ہیں اور ان کی تربیت، دیکھ بھال اور خوراک کے لیے بھی اچھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے۔ یہ بہت مہنگا شوق ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کھیل کو کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل کہا جاتا ہے۔ اس کھیل کے پُرخطر اور مہنگا ہونے کی وجہ سے اس کھیل کے کھلاڑیوں کی تعداد بھی دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ گلگت بلتستان میں جہاں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والے کھلاڑیوں کی تعداد ہزاروں میں ہے، وہاں پولو کھیلنے والے کھلاڑی سو سے زیادہ نہیں۔ گلگت بلتستان میں کھیلا جانے والا

پولو کا کھیل اگرچہ فری اسٹائل ہے، مگر کھیل کے دوران مجموعی طور پر نظم و ضبط برقرار رکھنے، کسی تنازعے کو حل کرنے اور مین آف دی میچ اور بہترین گھوڑے کا انتخاب کرنے کے لیے کچھ اصول اور ضوابط بھی مقرر ہیں۔ اس کے لیے ایک جیوری اور جج اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ گلگت بلتستان میں کھیلے جانے والے پولو کے چند اہم اصول و ضوابط ذیل میں بتائے جا رہے ہیں۔

1- پولو کی ٹیم چھ چھ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے، جب کہ ایک کھلاڑی زائد ہوتا ہے۔ 2- کھیل شروع ہونے سے دس منٹ پہلے اگر کوئی کھلاڑی واقعتاً اَن فٹ ہو تو جیوری دوسرے کھلاڑی کو کھیلنے کی اجازت دیتی ہے۔ وقت گزرنے کے بعد یا کھیل کے دوران کوئی کھلاڑی اَن فٹ ہو جائے تو دوسرے کھلاڑی کو کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ مخالف ٹیم کا اسی نمبر کا کھلاڑی کھیل سے آؤٹ کر دیا جاتا ہے اور پھر پانچ پانچ کھلاڑی کھیلتے ہیں۔ اسی طرح مزید کھلاڑی زخمی یا اَن فٹ ہو جائیں تو پھر چار چار کھلاڑی کھیلیں گے۔ مزید کھلاڑیوں کے زخمی یا اَن فٹ ہونے کی صورت میں یہی اصول لاگو ہوتا رہتا ہے۔ 3- پولو کے کھیل کے دوران اگر کوئی گھوڑا زخمی یا اَن فٹ ہو جائے تو گھوڑا تبدیل کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہوتی۔ 4- اس کھیل میں جو ٹیم پہلے نو(9) گول اسکور کرے وہ جیت جاتی ہے۔ نو گول اسکور نہ کرنے کی صورت میں مزید ایک گھنٹہ ہوتا ہے اور جس ٹیم کے اس ایک گھنٹے میں زیادہ گول ہوتے ہیں، وہ جیت جاتی ہے۔ اگر ایک گھنٹے میں دونوں ٹیموں کا اسکور برابر ہے تو اضافی وقت دیا جاتا ہے اور "گولڈن گول" سے فیصلہ ہوتا ہے، جب کہ فائنل میچ میں نو گول اسکور کرنے والا اصول لاگو نہیں ہوتا بلکہ فائنل میچ ایک گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل ہوتا ہے۔ 5- کھیل کے دوران اگر کوئی کھلاڑی بال کیچ کرتا ہے اور وہ بال لے کر گول میں داخل ہو جاتا ہے، تو گول تصور ہوتا ہے۔

گلگت بلتستان کے لوگوں میں مثبت سوچ پیدا کرنے، اتحاد و یک جہتی کے فروغ اور سیاحت کو پروان چڑھانے میں پولو کے کھیل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس امر کا اندازہ گلگت بلتستان میں کھیلے جانے والے کھیل پولو سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کھیل کی انفرادیت اور جاذبیت کے باعث ملکی و غیر ملکی سیاحوں اور محققین کی ایک بڑی تعداد گلگت بلتستان کا رخ کرتی ہے۔

پولو کے کھیل کی ایک قسم پولوکروس (Polocrosse) ہے جو دنیا بھر میں مقبول کھیل ہے اور براعظم امریکہ میں کھیلے جانے والے کھیل "Lacrosse" کے باہم امتزاج سے بنا ہے، پولوکروس مخلوط کھیلوں میں ایک منفرد کھیل ہے۔ واضح رہے کہ "Lacrosse" ایک ایسا کھیل ہے جس میں دو ٹیمیں ایک دوسرے پر گول کرتی ہیں۔ تاہم اس کے لیے کھلاڑیوں کے ہاتھ میں ایک ایسی اسٹک ہوتی ہے جس کے سرے پر تھیلی نما جال لگا ہوتا ہے اور اس جال ہی کے ذریعے کھلاڑی گیند پکڑ کر ایک دوسرے کو پاس دیتے ہوئے گول کرتے ہیں اور جہاں تک پولو کا تعلق ہے تو سب کو علم ہے کہ یہ گھوڑے پر بیٹھ کر اسٹک کی مدد سے گول کرنے کا کھیل ہے۔

پولوکروس میں استعمال ہونے والی چھڑی "Lacrosse" کی چھڑی کی مانند ہوتی ہے اور گھوڑے پر سوار کھلاڑی اسی جال میں گیند پھنسا کر یا ایک دوسرے کو پاس دیتے ہوئے چکر پورا کرتے ہیں اور گول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں بیڈمنٹن کے ریکٹ جیسی چھڑی ہوتی ہے، جس پر ڈھیلا جال بندھا ہوتا ہے۔ قوانین کے مطابق دونوں ٹیموں میں چھ چھ کھلاڑی ہوتے ہیں گیند عموماً ربڑ کی ہوتی ہے، جس کا قطر چار پانچ انچ تک ہوتا ہے۔ میدان کا مجموعی رقبہ 60x160 میٹر پر مشتمل ہوتا ہے۔ کھیل مجموعی طور پر چھ چکروں پر مشتمل ہوتا ہے، تاہم اس دوران کھلاڑی پولو کی مانند گھوڑے تبدیل نہیں کر سکتے۔ جدید پولوکروس کی ابتدا، دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک ماہر حیوانیات آسٹریلوی جوڑے مسٹر اینڈ مسز "Edward Hirst" نے کی تھی۔ ان دونوں نے اس کھیل کے قوانین مرتب کیے جو آج ہمیں پولوکروس کھیل کی شکل میں تیزی سے مقبول ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ انٹرنیشنل پولوکروس کونسل کے زیر اہتمام اب تک پولوکروس کے تین عالمی کپ منعقد ہو چکے ہیں۔ 2003ء اور 2007ء میں آسٹریلیا اور 2011ء میں جنوبی افریقہ نے عالمی کپ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ آئندہ پولوکروس ورلڈ کپ جنوبی افریقہ میں 2015ء میں منعقد ہوگا۔

تو یہ ہے پولو کھیلوں کا بادشاہ اور بادشاہوں کا کھیل۔ ☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ اگست 2014ء ہے۔

جولائی 2014ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، ان میں سے مجلس ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ (سید احتشام حیدر ہاشمی، راولپنڈی)
- فلائنگ کک نے کام دکھایا، مریض کا دانت اڑایا۔ (ام کلثوم، لاہور)
- قربان جاؤں عقل پر تمہاری، پیسے کی بچت اور کام بھی جاری۔ (حافظ شاہ فروغ، فیصل آباد)
- سرجری نہ آلات، کافی ہے بس لات۔ (عطیہ جلیل، لاہور)
- ڈاکٹر ہے قصائی، تصویر بھی کھنچوائی، داڑھ جو اٹکی تھی پھنسی بھی باہر نکل آئی۔ (عارفہ شیخ، کراچی)

نونہال مصور

ہوٹل

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔
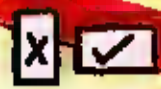
جویریہ یونس، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

ایمان زہراء، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

حنیٰ عاصم، اسلام آباد (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

عروج فاطمہ، راول پنڈی (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

سلیمان علی اعوان، راول پنڈی (پانچواں انعام: 85 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: سارہ فاطمہ، میاں والی۔ وجاہت رسول، بہاول پور۔ سرش مرتضیٰ، سرگودھا۔ ماہتاب عدیل، عدیل کاشف، لاہور۔ منال عدیل، لاہور۔ سونیا عدیل، لاہور۔ مریم عمر، راول پنڈی۔ محمد عدیل، چکوال۔ ماہم زہرہ، جواد حسن، راول پنڈی۔ نور فاطمہ، لاہور کینٹ۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ زینب احسن، پشاور۔ جویریہ یونس، لاہور۔ جنید ولی، رحیم یار خان۔ محمد تمد ولی، رحیم یار خان۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ مبشر القرآن، قصور۔ محمد احسن، راول پنڈی۔ فیصل آباد۔ فرخ ادا، ڈیرہ غازی خان۔ آمنہ بتول، سیال کوٹ۔ احسن شاہ، جہلم۔ حنا مشتاق، اسلام آباد۔ بانو قدسیہ، گوجرانوالہ۔ فہد رضا قصوری، کراچی۔ سحر سعید،

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اس نے بنائی ہے۔

اگست کا موضوع
یوم آزادی
آخری تاریخ 8 اگست

ستمبر کا موضوع
ڈرائی پورٹ
آخری تاریخ 8 ستمبر